فہرست

دیباچہ

الحمد للّٰہ!

یہ کتاب مائی ورک آن اسلام، جلد 1 آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہے، جس کا مقصد اسلام کے بنیادی اصولوں، عقائد اور عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہے تاکہ قارئین کو دینِ حق کی تفہیم میں مدد مل سکے۔

میں، عدنان خان، اس کتاب میں ذاتی اجتہادات اور غور و فکر کی بنیاد پر مضامین مرتب کر رہا ہوں۔ مختلف علماء کی

تفاسیر اور نظریات کا مطالعہ کرکے ان میں اپنی تشریح اور انتخابات شامل کیے ہیں۔ تاہم، میں عالم دین یا مفتی نہیں ہوں، اور میری علمی حدود و کمزوریاں بھی موجود ہیں۔ اس لیے میں قارئین کو واضح طور پر آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ کتاب میں دی گئی ہر بات پر بلا تحقیق یقین نہ کیا جائے، بلکہ خود تحقیق و تدبر کے بعد اس کی تصدیق کریں۔

کتاب میں احادیث کو طوالت سے بچانے کے لیے مکمل طور پر درج نہیں کیا گیا، بلکہ ان کے مفہوم اور حوالہ بیان کیے گئے ہیں تاکہ قارئین آسانی سے اصل پیغام تک پہنچ سکیں۔ ہر مضمون کے اختتام پر تحقیق و غور و فکر کی ترغیب دی گئی

ہے تاکہ قارئین اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق اسلامی تعلیمات

کو سمجھ سکیں اور عمل میں لا سکیں۔

اس کتاب کو میں نے ابتدائی طور پر خود تحریر کیا تھا، تاہم

چونکہ میں اردو گرامر اور اسلوب سے مکمل طور پر واقف

نہیں ہوں، اس لیے اب اسے دوبارہ ChatGPT کی مدد سے

ریفائن کیا گیا ہے تاکہ جملوں کی ساخت، الفاظ کا استعمال اور

عبارت کی روانی بہتر ہو سکے۔

میری یہ کوشش ہے کہ یہ کاوش قاری کے فہم و بصیرت میں

اضافہ کرے اور انہیں دینِ اسلام کے حقیقی مفہوم تک

پہنچانے میں مددگار ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ

کاوش نفع بخش ثابت ہو اور قارئین کو دینِ حق کی روشنی میں

رہنمائی عطا کرے۔

عدنان خان

مائی ورک آن اسلام، جلد 1

مسئلہ توحید و شرک

تمہید

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ

"اس جیسا کوئی چیز نہیں" (الشوری: 11)

یہ آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات، صفات اور افعال میں یکتا ہے، اس کی مانند کوئی نہیں۔ یہی بنیادی فرق ہے جو خالق اور مخلوق کو جدا کرتا ہے، اور یہی فرق توحید کو نمایاں کرتا ہے۔ اگر یہ فرق مٹا دیا جائے تو نتیجہ شرک کی صورت میں نکلتا ہے۔

اسی تناظر میں شرک کو تین زاویوں سے سمجھنا ضروری ہے۔ اگر کسی عمل یا عقیدے میں ان میں سے ایک بھی زاویہ پایا جائے تو وہ شرک ہے، ورنہ یا بدعت و حرام ہوگا یا پھر جائز۔

____

____

پہلا زاویہ: صفات و افعال میں کمال

اللہ تعالیٰ کی صفات کامل اور بے عیب ہیں۔ نہ ان میں کسی قسم کی کمی ہے اور نہ ہی ان پر کوئی حد یا قید لگتی ہے۔ اللہ ہی حقیقی عالم الغیب ہے، اس کا علم کامل ہے، اس کی قدرت لامحدود ہے، اور ہر چیز اس کے ارادے اور مشیت کے تابع ہے۔

اس کے برعکس مخلوق محدود ہے، اس کی صفات بھی ناقص اور محتاج ہیں۔ مخلوق نہ تو اپنے طور پر کامل علم رکھتی ہے، نہ لامحدود قدرت، اور نہ ہی ہر جگہ حاضر و ناظر ہو سکتی ہے۔

لہٰذا غیر اللہ کے لیے کامل علم (علمِ غیب)، کامل قدرت یا ہر

جگہ حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ رکھنا صریح شرک ہے۔

دوسرا زاویہ: ما فوق الاسباب اختیار

غیر اللہ کے لیے ما فوق الاسباب (یعنی بغیر کسی وسیلے اور

سبب کے) اثر یا تصرف ماننا بھی شرک ہے۔

اللہ تعالیٰ سننے اور دیکھنے کے لیے اسباب کا محتاج نہیں، جبکہ

مخلوق ہے۔ مخلوق اگر کچھ جانتی ہے تو اسباب کے ذریعے، اور

وہ بھی اللہ کے ارادے کے ماتحت۔ حتیٰ کہ نبی بھی وحی اور

معجزے کے ذریعے علم پاتے ہیں، لیکن ان کا یہ اختیار ذاتی

نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے ارادے پر موقوف ہوتا ہے۔

اسی طرح مخلوق کو نفع و نقصان پہنچانے والا ماننا ، لیکن

اللہ کی مشیت اور اسباب کے دائرے کے ساتھ، شرک نہیں ہے۔

لیکن اگر یہ عقیدہ ہو کہ وہ بلا واسطہ اور بغیر سبب کے نفع

یا نقصان پہنچا سکتی ہے، تو یہ شرک ہے۔

تیسرا زاویہ: استقلال اور ذاتی و عطائی

اگر غیر اللہ کو ایسے مستقل اختیارات دیے جائیں جن میں اللہ کی مشیت اور ارادے کا کوئی دخل نہ ہو تو یہ صریح شرک ہے۔ کیونکہ حقیقی استقلال صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے۔

اس تقسیم میں عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شفاعت کو رد نہیں کر سکتا، دراصل شفاعتِ قہری کا تصور ہے اور یہ شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی سفارش سے مجبور نہیں ہوتا بلکہ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس کی سفارش قبول کی جائے اور کس کی نہ کی جائے۔

یہاں یہ نکتہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ شرک صرف اس وقت نہیں ہوتا جب کسی کے لیے کل (مطلق) اختیارات مانے جائیں، بلکہ اگر محدود اختیارات بھی اس انداز سے مانے جائیں کہ وہ اللہ کی مشیت اور عطا سے ہٹ کر ذاتی یا مستقل یا مافوق الاسباب ہو جائیں، تو یہ بھی شرک کے زمرے میں آتا ہے۔

عملی مثالیں

- دوائی (پیناڈول وغیرہ): اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ یہ بذاتِ خود شفا دیتی ہے اور اللہ کے ارادے کا کوئی دخل نہیں،

تو یہ شرک ہے۔ لیکن اگر عقیدہ یہ ہو کہ یہ صرف سبب ہے، شفا دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے، تو جائز ہے۔

- انبیاء یا اولیاء کی مدد: اگر عقیدہ یہ ہو کہ وہ اللہ کے اذن کے بغیر مدد کر سکتے ہیں، تو یہ شرک ہے۔ اگر کہا جائے کہ وہ اللہ کے اذن اور اسباب کے دائرے میں محدود مدد کر سکتے ہیں تو اس پر قرآن و حدیث سے دلیل درکار ہوگی، ورنہ یہ بدعت شمار ہوگی۔

- قبر والوں کو پکارنا: قرآن کے مطابق برزخ میں رہنے والے زندہ لوگوں کی پکار سے غافل ہیں (الاحقاف: 5)۔ لہٰذا انہیں مدد کے لیے پکارنا جہالت ہے، اور اگر مذکورہ شرکیہ مفہوم پایا جائے تو یہ صریح شرک ہے۔

- سجدہ: اگر سجدے میں غیر اللہ کو عبادت کے لائق ماننے کا عقیدہ ہو تو یہ شرک ہے۔ لیکن پچھلی شریعتوں میں تعظیمی سجدہ جائز تھا ، جیسے فرشتوں نے آدمؑ کو کیا۔ ہماری شریعت میں یہ حرام ہے، اگرچہ شرک نہیں۔

عبادت اور اس کا نتیجہ

عبادت دراصل انتہائی درجے کی عاجزی اور بے بسی کا اظہار ہے۔ یہ تینوں زاویوں کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ ہی کامل صفات و افعال والا ہے، ما فوق الاسباب متصرف

ہے، اور اپنی مشیت میں آزاد ہے، تو لا الہ الا اللہ کی حقیقت بھی

واضح ہو گئی۔

لہٰذا صرف اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔ اس کے سوا کسی کو

ایسی عاجزی اور انکساری کے ساتھ پکارنا یا جھکنا شرک ہے۔

____

____

نتیجہ

اپنے ہر عقیدے اور عمل کو ان تین زاویوں پر پرکھنا ضروری

ہے:

1. کیا غیر اللہ کو اللہ کے کامل صفات یا افعال میں شریک

مانا جا رہا ہے؟

2. کیا غیر اللہ کو ما فوق الاسباب اختیار دیا جا رہا ہے؟

3. کیا غیر اللہ کو مستقل اور خودمختار سمجھا جا رہا ہے؟

اگر ان میں سے ایک بھی مفہوم پایا جائے تو وہ شرک ہے۔ ورنہ وہ یا بدعت اور حرام ہوگا، یا پھر دلیل کے ساتھ جائز۔

✦ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

لا الٰہ الا اللہ اور عبادت میں فرق

لا الٰہ الا اللہ اور عبادت کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ بھی اللہ کی عبادت کرتے تھے، لیکن وہ غیر اللہ کی عبادت کی نفی نہیں کرتے تھے۔ وہ اللہ کے ساتھ دوسرے معبودوں کی پرستش بھی کرتے تھے۔ اس کے برعکس، "لا الٰہ" غیر اللہ کی عبادت کی نفی کرتا ہے اور "الا اللہ" اللہ کے لیے خاص عبادت کو ثابت کرتا ہے۔ اس طرح ایک مومن بندہ عبادت میں صرف اور صرف اللہ کو خاص کرتا ہے۔

درحقیقت عبادت اپنی حقیقت کے اعتبار سے صرف ایک ہی

ہستی کی ممکن ہے۔ کیونکہ عبادت کی تعریف ہی یہ ہے:

"انتہائی درجے کی عاجزی اور بے بسی کے اظہار کا نام عبادت

ہے کہ بندے کے پاس گھٹنے ٹیکنے کے علاوہ کوئی دوسرا آپشن

باقی نہ رہے۔"

اگر بالفرض دو یا زیادہ کی عبادت ممکن ہوتی، تو انسان کسی

ایک کے سامنے انتہائی عاجزی اختیار کرنے پر مجبور نہ ہوتا۔

مثال کے طور پر اگر اللہ تعالیٰ ہماری ضرورت پوری نہ کرتا تو

ہم کسی نبی یا ولی کی طرف رجوع کر لیتے۔ اس صورت میں ہم

اللہ کے سامنے انتہائی درجے کے عاجز نہ ہوتے، کیونکہ ہمارے

پاس دوسرا آپشن موجود ہوتا۔ اور جب آپشن موجود ہو تو حقیقی عبادت سرے سے پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ایک سے زیادہ معبود کا ہونا فطرت اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔

مخلوق کی فطرت میں ہی انتہائی عاجزی اور بے بسی ہے، اور یہی عاجزی اللہ تعالیٰ کے سامنے کامل طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق اور کائنات کے نظام پر غور و فکر کیا جائے تو یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انسان ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا انتہائی محتاج ہے۔

اسی لیے انبیاء علیہم السلام قرآن مجید میں اپنی قوموں کو

صرف یہ کہا کرتے تھے:

"اعبدوا اللہ" (اللہ کی عبادت کرو)۔

وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ "اکیلے اللہ کی عبادت کرو"، کیونکہ

جب اللہ کی عبادت کا حکم دیا جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ

ہوتا ہے کہ دوسروں کی عبادت خودبخود باطل ہو جاتی ہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی فضیلت

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (مفہوم):

"میں نے جن و انس کو اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔"

یعنی انسان اور جن کا مقصدِ حیات یہی ہے کہ وہ ہمیشہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" کا اظہار کریں اور اسی پر قائم رہیں۔

ایک اور مقام پر قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے (مفہوم):

"ہم نے زمین و آسمان کو اس لیے پیدا کیا تاکہ انسان ان میں

غور و فکر کرے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اللہ ہی کامل علم

اور کامل قدرت والا ہے۔"

پس یہ حقیقت واضح ہوئی کہ زمین و آسمان کی تخلیق کا

مقصد یہ ہے کہ انسان معرفتِ الٰہی حاصل کرے، اللہ کے

کامل علم و قدرت کو پہچانے، اور اس معرفت کی روشنی میں

عبادت کے صحیح مفہوم کو سمجھے۔ یہی معرفت اسے اس

نتیجے تک لے جاتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور

عبادت صرف اسی کے شایانِ شان ہے۔

والله تعالیٰ أعلم

دعوئ توحید

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

دعویٰ:

"لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" دراصل توحید کا عظیم دعویٰ ہے۔ یہ اعلان ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور حقیقی عبادت کا مستحق صرف وہی ہے۔

دلائل:

اس دعوے کی تصدیق اور وضاحت کے لیے باقی کلمات دلیل کے

طور پر ہیں، جو یہ واضح کرتے ہیں کہ آخر کیوں اللہ کے سوا

کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے:

1. وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ

اللہ اپنی ذات، صفات اور افعال میں اکیلا ہے۔ اس کا کوئی

شریک، ہمسر یا نظیر نہیں۔

قرآن کہتا ہے: "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" (الشوری: 11)

ترجمہ: اس جیسا کوئی نہیں۔

جب اللہ کا کوئی مثل ہی نہیں تو مخلوق اس کی حقیقت کو کبھی نہیں پا سکتی۔ انسان جتنا بھی اللہ کا تصور کرے، وہ اللہ کی شان سے بہت کم اور محدود ہو گا۔ اللہ ہر تصور سے پاک اور اعلیٰ ہے۔ ہم صرف اتنی معرفت کے مکلف ہیں کہ تحقیق و غور و فکر کے ذریعے اس نتیجے تک پہنچیں کہ "اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے"، اور اللہ کو اپنے بندوں سے یہی معرفت مطلوب ہے۔

2. لَهُ الْمُلْكُ

زمین و آسمان اور ہر شے کی حقیقی بادشاہی اور ملکیت صرف اللہ کی ہے۔ وہ اپنی بادشاہی میں کامل طور پر آزاد ہے۔ مخلوق کی ملکیت حقیقی نہیں بلکہ عارضی ہے، اور وہ بھی اللہ کی مشیت اور ارادے کے تابع ہے۔

3. وَلَهُ الْحَمْدُ

ساری کامل اور بے عیب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اس کی ذات میں کوئی کمی نہیں، اس کی صفات میں کوئی نقص نہیں، اور اس کے افعال میں کوئی عیب نہیں۔ حقیقی حمد و ثنا صرف اسی کے شایانِ شان ہے۔

4. وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ

اللہ کامل قدرت والا ہے۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔ وہ ہر چیز پر اختیار رکھتا ہے، اور اس کے ارادے کے بغیر کائنات میں ذرہ برابر بھی حرکت نہیں ہو سکتی۔

نتیجہ:

یوں "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" محض ایک جملہ نہیں، بلکہ ایک عظیم دعویٰ ہے جو ان دلائل سے ثابت ہے:

اللہ اپنی ذات و صفات میں اکیلا ہے۔

حقیقی ملکیت صرف اسی کی ہے۔

کامل تعریفیں صرف اسی کے لیے ہیں۔

اور وہی کامل قدرت والا ہے۔

پس یہ حقیقت سورج کی روشنی کی طرح واضح ہے کہ اللہ ہی
واحد معبود ہے، اور اسی کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

واللہ تعالیٰ أعلم

شریعت کا موضوع

جیسے "چاقو" ایک لفظ ہے جو خاص معنی کے لیے وضع کیا گیا ہے: اس کا دستہ اور پھل، جس کے ذریعے کاٹا جاتا ہے۔ جب کوئی "چاقو" کہتا ہے تو فوراً ہمارے ذہن میں اس کا دستہ اور پھل آ جاتا ہے۔

اسی طرح "شریعت" بھی ایک لفظ ہے جو خاص طور پر "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللہ" کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

یعنی شریعت کا اصل موضوع اور مرکز لَا إِلٰهَ إِلَّا اللہ ہے۔

اظہارِ شریعت

"لَا إِلٰهَ إِلَّا اللہ" کے اظہار کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر نازل فرمایا۔

نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور دیگر عبادات دراصل اسی حقیقت کے اظہار کے عملی طریقے ہیں۔

لہٰذا اجمالی ایمان میں جب کہا جاتا ہے کہ "ہم شریعتِ محمدی کی تصدیق کرتے ہیں" تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ہم "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ" کی تصدیق کرتے ہیں۔

یعنی "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللہ" شریعت کا موضوع ہے، اور "محمدٌ رَّسُوْلُ اللہ" اس موضوع کے اظہار کا طریقہ ہے۔ یہ اظہار صرف نبی کریم ﷺ اور قرآن و حدیث کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق ہوگا۔

توحید اور عبادت

"لَا إِلٰهَ إِلَّا اللہ" دراصل توحید فی الذات، توحید فی الصفات اور توحید فی الافعال کا نتیجہ ہے۔

"إلٰہ" کے معنی ہیں "معبود"، اور "معبود" وہ ہے جو عبادت کے

لائق ہو۔

جبکہ "عبادت" کی حقیقت یہ ہے کہ انسان انتہائی درجے کی

عاجزی اور بے بسی کا اظہار کرے، اس طرح کہ اس کے پاس

جھکنے اور سجدہ کرنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه (توحید) کے لوازمات

"لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه" محض ایک کلمہ نہیں بلکہ ایک مکمل عقیدہ ہے، جس کے کئی لوازمات ہیں۔ یہ لوازمات خود بخود اس کلمے کے مفہوم اور تقاضوں سے ظاہر ہوتے ہیں:

1. اظہار کے طریقے

اللہ تعالیٰ نے "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه" کے اظہار کے طریقے انبیاء علیہم السلام پر وحی اور کتابوں کے ذریعے، فرشتوں کے واسطے سے نازل فرمائے۔

لہٰذا اس کلمے کی تکمیل کے لیے انبیاء، فرشتوں اور آسمانی

کتابوں پر ایمان لانا لازم ہے۔

2. قبول و انکار کا نتیجہ

"لَا إِلٰهَ إِلَّا اللہ" کو ماننے یا نہ ماننے کے نتائج ہیں۔

اس سے بعث بعد الموت (مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا) اور

قیامت کے دن حساب و کتاب پر ایمان لانا لازم ہے۔

3. ثمرات و محرومی

اس کلمے کو ماننے والوں کے لیے آخرت میں جنت ہے، اور انکار

کرنے والوں کے لیے جہنم۔

یوں جنت و جہنم کی سچائی کی تصدیق بھی "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه" کا

لازمی تقاضا ہے۔

4. توحید فی الذات، الصفات، والافعال

چونکہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه" دراصل اللہ کی ذات، صفات اور افعال کی

توحید کا نتیجہ ہے، اس لیے ان سب پر ایمان لانا لازم ہے۔

5. تقدیر پر ایمان

اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک اس کا علمِ ازلی ہے۔

اس علم کے تقاضے کے طور پر تقدیر پر ایمان لانا بھی "لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللہ" کے لوازمات میں شامل ہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے تقاضے

اللہ تعالیٰ حاکمیت میں یکتا اور اکیلا ہے۔

"حاکمِ حقیقی" سے مراد یہ ہے کہ صرف اللہ کا حکم اور فیصلہ

اٹل اور قطعی ہے۔ خواہ وہ امورِ تکوینی ہوں یا شریعت کے احکام

(حلال و حرام کا تعین) — ان سب میں فیصلہ کرنے کا

اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔

جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:

> إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ

(الحکم صرف اللہ ہی کا ہے)

غیر اللہ کے حکم ماننے کی دو صورتیں

1. اگر کوئی شخص اللہ کے حرام کردہ عمل کو غیر اللہ کے کہنے پر حلال سمجھ کر کرے (یعنی یقینی علم کے ساتھ) تو اس نے غیر اللہ کو اللہ کی صفتِ "حَکَم" میں شریک ٹھہرایا۔ یہ شرک ہے۔

2. لیکن اگر وہ شخص اسی حرام عمل کو حرمت کے عقیدے

کے ساتھ کرے (یعنی مانتا ہے کہ یہ حرام ہے مگر کرتا ہے) تو یہ

شرک نہیں بلکہ گناہ ہے۔

اسی اصول میں اپنے جذبات اور ملکی حکومت بھی شامل ہیں۔

اگر حکومت سود کو حلال قرار دے اور کوئی شخص بھی اسے

حلال مان کر کرے تو یہ شرک ہے، ورنہ یہ گناہ ہوگا۔

نبی کریم ﷺ کا حکم اصل میں اللہ کا حکم ہے

رسول اللہ ﷺ کے احکامات دراصل اللہ کے ہی احکامات ہیں، کیونکہ آپ ﷺ اللہ کے پیغام کے صرف مبلغ ہیں۔

قرآن میں ہے:

"جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی" (النساء: 80)

اور ایک اور جگہ فرمایا:

" >وہ (دین میں) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، ان کا ہر
کلام وحی کے ذریعے ہوتا ہے" (النجم: 3-4)

لہٰذا یہ دعویٰ غلط ہے کہ "حدیث نبی ﷺ کے ذاتی احکام ہیں"۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی ﷺ کا حکم اللہ کا ہی حکم ہے۔

والدین، اساتذہ اور بڑوں کی اطاعت

والدین، اساتذہ، حکمران یا کسی بھی بڑے کا جائز حکم ماننا دراصل اللہ کے حکم کو ماننا ہے۔ کیونکہ یہ اطاعت اللہ کی دی ہوئی تربیت اور ربوبیت کا حصہ ہے۔

لیکن اگر وہ ناجائز حکم دیں اور کوئی شخص اسے ناجائز سمجھ کر مانے تو یہ گناہ ہے، شرک نہیں۔ اور اگر ناجائز کو حق سمجھ کر مانے تو پھر شرک ہے کیونکہ تقدیر و حاکمیت صرف اللہ کا حق ہے۔

فتویٰ کفر اور احتیاط

اللہ کے حلال کو حرام کرنے والے پر فوراً کفر کا فتویٰ نہ لگایا جائے، کیونکہ اس کے لیے شرائط اور تفصیلات ہیں۔

گناہ کو شرک نہ سمجھنے کا فائدہ

اللہ کے حرام کو حرام سمجھ کر کرنے والا گناہگار ہے، مشرک نہیں۔ اس فرق میں حکمت ہے:

مومن گناہ کرتا ہے تو دل میں ندامت اور توبہ کی کیفیت ہوتی

ہے۔

یہی کیفیت مومن کو نیکی کی طرف مائل کرتی ہے تاکہ وہ اپنے

گناہ کو مٹا سکے۔

اگر اسے یہ سکھایا جائے کہ "یہ گناہ نہیں تھا"، تو وہ بے فکر

ہو جائے گا اور نیکی کی طرف متوجہ نہیں ہوگا۔ یہی بے فکری

فساد کا باعث بنتی ہے۔

نصیحت اور حکمت

مومن کو نصیحت فائدہ دیتی ہے۔

اگر وہ گناہ میں غفلت یا بھول کی وجہ سے پڑا ہے تو حکمت کے ساتھ یاد دہانی کروائی جائے۔

لیکن اگر جان بوجھ کر گناہ کرتا ہے تو بار بار ٹوکنا فائدہ نہیں دیتا۔

ہر معاملے میں حکمت ضروری ہے:

کب سختی کرنی ہے؟

کب نرمی اختیار کرنی ہے؟

کب خاموشی بہتر ہے؟

کب غصہ ظاہر کرنا مناسب ہے؟

اصل مقصد صرف خیرخواہی اور اصلاح ہے، دل کی بھڑاس نکالنا نہیں۔

حکمت کی ضرورت

قرآن و حدیث کے احکامات تحریری شکل میں ہیں۔ انہیں

صحیح وقت اور موقع پر اپلائی کرنے کے لیے حکمت درکار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم پانچ وقت نماز میں دعا کرتے ہیں:

> اهدِنَا الصِّرَاطَ الْمُستَقِيمَ

(اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا)

عبرت

ہمارے علاقے میں ایک بار شریعت نافذ کی گئی، مگر حکمت کے بغیر۔ ایسے خلیفہ مقرر ہوئے جو حکمت سے خالی تھے۔ اس کے نتیجے میں لوگ خلافت سے متنفر ہو گئے۔

واللہ تعالیٰ أعلم

اللہ حاکم ہے، ہمارے جذبات نہیں

انسان بچپن سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک اپنے ماحول سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ یہ چیزیں اس کے مزاج اور جذبات میں داخل ہو جاتی ہیں، اور یہی جذبات انسان سے مختلف مطالبات کرتے ہیں: کچھ درست اور کچھ غلط۔

اکثر انسان یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ حلال و حرام کا تعین

ہمارے جذبات کرتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ حلال و

حرام کا فیصلہ صرف اللہ کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے

بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کریں۔

اس حکم میں یہ پیغام تھا کہ:

اولاد کو قتل کرنا اس لئے حرام نہیں کہ انسان کے جذبات اسے

برا سمجھتے ہیں،

بلکہ اس لئے حرام ہے کہ اللہ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔

اور جب اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کے ذبح کرنے کا

حکم دیا تو وہی عمل عارضی طور پر حلال ہو گیا۔

پردہ اور جذبات

اسی طرح عورتوں کا پردہ اس لئے فرض نہیں ہے کہ ہمارے
جذبات یا غیرت کا یہ تقاضا ہے، بلکہ اس لئے فرض ہے کہ اللہ
نے اسے فرض کیا ہے۔

اور فرض بھی اسی حد تک ہے جس حد تک اللہ نے قرار دیا ہے۔

جذبات کا مقابلہ

بچپن سے راسخ جذبات کا مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی کبھی اجتہادی خطا واقع ہوئی۔

اجتہادی خطا پر ایک نیکی بھی ملتی ہے، اس لئے اسے گستاخی نہیں سمجھنا چاہئے۔

البتہ اجتہادی خطا پر عمل کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

اہلِ عرب بعض اوقات عورتوں کے معاملے میں اتنے غیرتی اور جذباتی تھے کہ بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ ایسے ماحول میں ان کے جذبات کا تقاضا سخت ترین پردہ تھا۔ مگر فیصلہ کن بات یہی ہے کہ حاکمِ اللہ ہے، جذبات نہیں۔

کم عمری کی شادی کا معاملہ

نو سال کی عمر کی لڑکی سے شادی اس لئے حلال یا حرام نہیں کہ ہمارے جذبات کیا کہتے ہیں، بلکہ اس لئے ہے کہ اللہ کا کیا حکم ہے۔

اسی ذہن کو پروان چڑھانے کے لئے اللہ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کم عمری میں نکاح و شادی کریں، تاکہ دنیا کو پیغام ملے کہ حاکم صرف اللہ ہے۔

یہ امتحان نبی کریم ﷺ کے لئے ابراہیم علیہ السلام کے امتحان سے بھی سخت تھا، کیونکہ عرب عورتوں کے معاملے

میں بہت سخت تھے اور کفار کو کسی بہانے کی تلاش رہتی

تھی۔

نیت اور عمل کا فرق

اگر کسی نے چور کو دیکھ کر گواہی دی اور نیت اللہ کی رضا

تھی تو اسے ثواب ملے گا۔

اگر انتقام کی نیت سے گواہی دی تو یہ عمل جائز ہے (نہ ثواب ہے نہ گناہ)۔

اسی طرح محارب کافر کو قتل کرنا اگر اللہ کی رضا کے لئے ہے تو جہاد ہے، اور اگر جذباتی انتقام کے لئے ہے تو یہ صرف جائز عمل ہے۔

گستاخ رسول ﷺ کی سزا

محارب گستاخِ رسول کے بارے میں

اگر نبی کریم ﷺ نے کسی محارب گستاخ کو قتل کیا تو اس میں اصل نیت اللہ کی رضا اور جہاد تھا ، مگر ساتھ ہی اس میں امت کو یہ تعلیم بھی دی کہ اگرچہ اصل مقصد اللہ کی خوشنودی ہے، لیکن محارب گستاخ پر قتل کے ذریعے دل کی بھڑاس نکالنا بھی جائز ہے۔ البتہ یہ بھڑاس خود ثواب کا درجہ نہیں رکھتی، بلکہ ایک طرح کا "جائز عمل" ہے۔ قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے:

> قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ

وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ (التوبہ: 14)

"ان سے لڑو، اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے گا،

انہیں رسوا کرے گا، تمہیں ان پر غلبہ عطا کرے گا اور

مومنوں کے دلوں کو ٹھنڈک بخشے گا۔"

اس آیت سے واضح ہے کہ جہاد کا اصل مقصد اللہ کی رضا اور

دین کی سربلندی ہے، جبکہ مومنوں کے دلوں کی ٹھنڈک اور

بھڑاس نکل جانا بطور "اضافی انعام" ہے، مقصود نہیں۔

واضح رہے کہ دین اسلام خیر خواہی کا نام ہے ۔

اگرچہ جذبات چاہتے ہیں کہ ہر گستاخ کو فوراً ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے، لیکن فیصلہ اللہ کا ہے، ہمارا نہیں۔ حاکم للہ ہے ہمارے جذبات نہیں ۔

جذباتی دین کے نقصانات

اسلام کی بنیاد یہی ہے کہ اللہ حاکم ہے، جذبات نہیں۔

اسی کی مشق نہ کرنے کی وجہ سے دین میں بدعات اور شرکیات

پیدا ہوئیں۔

قرآن کے ذریعے فیصلہ

اللہ تک پہنچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک بار اپنے تمام جذبات

کو سائیڈ پر رکھ کر خالص دل سے قرآن و حدیث کا مطالعہ

کریں۔

ضد و عناد،

تعصب،

شخصیت پرستی،

باپ دادا کی اندھی تقلید،

بغض، حسد،

تکبر،

غیرت و شرم کے جذبات،

یا محبت و نفرت کے جذبات

—— سب کو چھوڑ کر صرف اللہ کے فیصلے کو دیکھیں۔ اللہ

تعالیٰ ضرور حق کو واضح فرما دے گا۔

واللہ تعالیٰ أعلم

اللّٰہ کی بقدرِ حق معرفت اور عبادت کے اظہار کا طریقہ

فرض کریں ایک شخص جنگل میں پیدا ہوا اور وہ طالبِ حق

ہے۔

وہ زمین و آسمان کی پیدائش میں غور و فکر کرتا ہے اور اس

نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اللّٰہ کا وجود ہے۔ پھر مزید سوچ بچار کے

بعد یہ حقیقت اس پر کھلتی ہے کہ اللّٰہ کی صفات —— جیسے

قدرت اور علم —— کامل اور مکمل ہیں، جن میں ذرّہ برابر

کمی نہیں۔ جو کچھ انسان کے تصور میں آتا ہے، اللّٰہ اس سے

بلند تر اور برتر ہے، اور کوئی بھی اس کی صفات کا احاطہ نہیں

کر سکتا۔ یہ سب دیکھ کر طالبِ حق سوچتا ہے کہ آخر کس

درجے تک اللّٰہ کی معرفت حاصل کی جائے؟

مزید غور و فکر اسے اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ہم مخلوق اللّٰہ

کے سامنے انتہائی درجے کے عاجز اور بے بس ہیں، اور یہی

عاجزی دراصل عبادت ہے۔

مگر اللّٰہ قرآن میں فرماتا ہے کہ اگر کوئی یہ گمان کرے کہ وہ

اپنی مرضی سے عاجزی اور عبادت کے طریقے متعین کر سکتا ہے،

اور اسے اللّٰہ کی طرف سے کسی رہنمائی یا کتاب کی ضرورت

نہیں، تو یہ حق معرفت نہیں:

> وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ

(الأنعام: 91)

"انہوں نے اللہ کی وہ قدر نہ جانی جیسی جانی چاہیے تھی، جب انہوں نے کہا کہ اللہ نے کسی انسان پر کچھ بھی نازل نہیں کیا۔"

لہٰذا عبادت کا اظہار اللہ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگا:

1. اس لیے کہ حکم صرف اللہ کا ہے:

"اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ" — یعنی تخلیق اور شریعت کے تمام فیصلے صرف اللہ کے ہیں۔ حلال و حرام کا اختیار صرف اسی کے پاس ہے، اور اسی کا فیصلہ حتمی ہے۔

2. اس لیے کہ اللہ کامل علم اور حکمت والا ہے:

انسان صرف ظاہر دیکھتا ہے اور غیر متوازن قوانین بنا لیتا ہے، لیکن اللہ ظاہر اور باطن دونوں جانتا ہے اور ایسا قانون عطا کرتا ہے جو متوازن اور فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے۔

پس اے طالبِ حق! جب تم اس نتیجے پر پہنچ جاؤ کہ عاجزی اور عبادت کا اظہار اپنی مرضی سے نہیں، بلکہ اللّٰہ کے بتائے ہوئے طریقے پر ہی ہوگا، تب جا کر تم نے اللّٰہ کی بقدرِ حق معرفت حاصل کی ہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم

● مافوق الاسباب اور ما تحت الاسباب

اللہ تعالیٰ کی بعض صفات ایسی بھی ہیں جو الفاظ کی حد تک بندوں کے لئے ثابت ہوتی ہیں مثلاً اللہ تعالی سمیع، بصیر، علیم اور متکلم ہیں اور انسان پر بھی ان الفاظ کا اطلاق جائزہے ، ان جیسی صفات میں مناط شرک یہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے مافوق الاسباب یہ صفات ثابت کی جائیں ، اسی طرح تدبیر و استمداد وغیرہ مسائل میں بھی ما فوق الاسباب اور ماتحت الاسباب کی تفصیل ہے کہ ما تحت الاسباب استمداد تو غیر اللہ سے جائزہے لیکن اگر اللہ تعالی کے علاوہ کسی کو قادر مستقل جان کر مافوق الاسباب استمداد کی جائے تو یہ شرک ہے ،، اس تفصیل کے متعلق بعض اوقات غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اس کا

ماخذ و مصدر کیا ہے ؟ اور اس تفصیل کی کیا ضرورت ہے؟

چنانچہ علامہ اشرف سیالوی صاحب نے "گلشن توحید و رسالت

" میں کئی مقامات پر اس تفصیل کی تردید فرمائی اور اس کو

لغو قرار دیا ، اس لئے اس بات کی وضاحت کرنی مناسب ہے۔

ما فوق الاسباب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسباب و آلات کے بغیر

کوئی کام کیا جائے اور ماتحت الاسباب سے مقصود یہ ہوتا ہے

کہ اسباب و آلات کے دائرہ میں رہتے ہوئے کوئی کام کیا جائے۔

۔۔۔۔ اس قید کی ضرورت ۔۔۔۔

غور کریں تو واضح ہو گا کہ اس قید کی اہمیت و ضرورت کے

لئے کوئی خاص جزئیہ ضروری نہیں ہے بلکہ کئی جگہوں میں

خود مناط شرک کے تحقق کے لئے یہ قید لگانا ضروری ہوتا ہے

مثلاً غیر اللہ سے استعانت کا مسئلہ ہے کہ استعانت و استمداد

کی ایک قسم ایسی ہے جو بالا تفاق غیر اللہ سے کرنا جائز ہے اور

ایک قسم وہ ہے جو اللہ تعالی ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور غیر

اللہ سے ایسی استعانت کرنا شرک ہے، اب مستعان و معین ہو

نا گو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے مگر علی الاطلاق یہ صفت

مخصوصہ نہیں ہے جس کا غیر اللہ کے لئے اثبات جائز نہ ہو

بلکہ وہ تو استعانت کی ایک خاص قسم ہے، گویا استعانت

بالغیر کی دو قسمیں ہوئی : ایک جائز اور دوسری حرام و

موجب شرک، ان دونوں قسموں کی باہمی تمیز وامتیاز کے لئے

یہ تفصیل کی جاتی ہے کہ ایک ما فوق الاسباب استعانت بالغیر

ہے اور ایک ماتحت الاسباب ، تا کہ واضح ہو جائے کہ مطلق

استعانت نکتہ اختصاص نہیں ہے بلکہ استعانت مافوق

الاسباب طور پر ہو مستعان کے متعلق قدرت مستقلہ کا اعتقاد

ہو تو یہ صفت باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے جس کا غیر

اللہ کے لئے ثابت ماننا موجب شرک ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جس طرح حضرت متکلمین نے کسب اور خلق

کے درمیان ایک فرق یہ بھی بیان کیا ہے کہ :

إن الكسب واقع بألة والخلق لا بألة. (شرح العقائد مع النبراس

، ص .)

ترجمہ : کسب بذریعہ ٔلہ واقع ہوتا ہے اور خلق بغیر کسی الہ

کے۔

"شرح فقہ اکبر میں ہے:

الحاصل أنّ الفرق بين الكسب والخلق هو أن الكسب أمر لا

يستقل به الكاسب والخلق أمر مستقل به الخالق. " (شرح

الفقه الأكبر، ص .)

ترجمہ : کسب اور خلق میں فرق یہ ہے کہ کسب میں کاسب

مستقل نہیں ہوتا جبکہ خلق میں خالق مستقل ہوتا ہے کسی

اور کا محتاج نہیں ہوتا۔

کسب کا تعلق انسان کے ساتھ ہے اور خلق کا اللہ تعالی کے ساتھ

، افعال عباد کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور کاسب خود حضرت

انسان ہے ، ان دونوں کے درمیان حد فاصل یہ ہے کہ کسب میں

اسباب و آلات کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ بندگان کے ساتھ متعلق

ہے کیونکہ وہی اسباب کے محتاج ہوتے ہیں جبکہ خلق میں

اسباب کی مطلق ضرورت نہیں ہے کہ اللہ تعالی صمد و غنی ہے ،

وہ اسباب و آلات کا ہر گز محتاج نہیں ہے، یوں ہی اسباب کے

دائرہ میں رہتے ہوئے سماع ور رؤیت اور اعانت کرنے کی صفت

حضرت انسان کی ہے اور بغیر اسباب کے ہر کسی کی آواز سننا ،

تمام مخلوقات کی حرکات و سکنات دیکھنا اور چاہے تو ہر

مخلوق کی اعانت کرنا اللہ تعالی ہی کی صفات ہیں، اسی کو

مافوق الاسباب اور ماتحت الاسباب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مصنف: مفتی عبید الرحمان

کتاب: مسئلہ توحید و شرک

اللّٰہ کی رضامندی

کائنات میں کوئی عمل یا چیز اپنی ذات میں اثر نہیں رکھتی،

سب کچھ اللّٰہ کی مشیت کے تابع ہے۔ حتیٰ کہ جنت کی راحت

اور جہنم کی تکلیف بھی اسی کے اذن اور ارادے سے قائم ہیں۔

کبھی انسان نرم بستر پر بے سکون ہوتا ہے، اور کبھی سخت

پتھروں پر آرام محسوس کرتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ

ہم ہر حال میں اللّٰہ کے محتاج ہیں۔

دنیا کی نعمتیں اللّٰہ کی مشیت سے ملتی ہیں، مگر ان کا ملنا اس

بات کی ضمانت نہیں کہ اللّٰہ راضی بھی ہے۔ جبکہ اصل

کامیابی، جہنم سے نجات اور جنت میں دخول صرف اللّٰہ کی

رضامندی پر موقوف ہے۔ اگر اللّٰہ راضی نہ ہوا تو انسان

نعوذباللہ ہمیشہ کے لیے خسارے میں پڑ جائے گا۔

اسی لیے قرآن ہمیں ترغیب دیتا ہے کہ نیک اعمال کو وسیلہ بنا

کر صرف دنیاوی نعمتیں ہی نہ مانگو، بلکہ سب سے بڑھ کر

اللّٰہ کی رضامندی کو مقصد بناؤ۔

دنیاوی نعمتیں مانگنے کی ممانعت نہیں، بلکہ ترغیب بھی ہے،

حتیٰ کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ جوتے کا تسمہ بھی اللّٰہ سے

مانگو۔ لیکن اصل محنت اور جدوجہد اللّٰہ کی رضا کے لیے

ہونی چاہیے، کیونکہ اسی میں ابدی کامیابی ہے۔

عقل مندی یہ ہے کہ ایک ہی عمل سے دنیا اور آخرت دونوں کا

فائدہ حاصل کیا جائے۔ مثال کے طور پر حلال روزی کمانا

اس نیت سے کہ فرائض ادا کر سکوں۔ اس سے دنیاوی ضرورت

بھی پوری ہوگی اور اللّٰہ کی رضا بھی حاصل ہوگی۔ قرآن کہتا ہے

کہ جو عمل اللّٰہ کی رضا کے لیے کیا جائے، اس کے بدلے میں

دنیا کی نعمتیں بطور بونس عطا کی جاتی ہیں۔

اسی طرح نیک اعمال یا اسمائے حسنیٰ کو وسیلہ بنا کر نعمت

مانگنا، دراصل اس نیت سے ہونا چاہیے کہ اللّٰہ دعاؤں سے راضی

ہوتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جہنم سے نجات اور

جنت کی طلب کے لیے نیک عمل کرنا بھی دراصل اللّٰہ کی

رضامندی ہی کے حصول کی ایک صورت ہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم

مومن کے گناہ کی کیفیت

انسان جب کسی نعمت کے حصول کی کوشش اس نظریے سے کرتاہے کہ یہ اللّٰہ کی مشیت کے بغیر بھی مل سکتی ہے، تو یہ شرک ہے، چاہے وہ نعمت کو نیکی کے ذریعے ہی کیوں نہ تلاش کر رہا ہو۔ (شرک کی حالت میں نیکی کا بدلہ صرف دنیا میں دیا جاتاہے، اور اس بدلے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، حتیٰ کہ ظاہری ایمان بھی۔)

لیکن اگر انسان یہ اعتقاد رکھے کہ نعمت صرف اللّٰہ کی مشیت

سے ہی مل سکتی ہے، تو یہ شرک نہیں ہے، چاہے وہ نعمت کو

گناہ کے راستے میں ہی کیوں نہ تلاش کر رہا ہو۔ مومن کے گناہ

کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

کسی نعمت کے حصول کے لیے اللّٰہ کی طرف سے دو راستے ہوتے

ہیں: جائز اور ناجائز۔ دونوں میں نعمت اللّٰہ ہی دیتا ہے، مگر

دونوں کا انجام مختلف ہے:

جائز راستہ: نیکی اس کے بدلے میں کٹتی ہے، لیکن اللہ مزید

اجر عطا کرتا ہے۔ اس میں خیر ہوتا ہے، نیکی کی توفیق بڑھتی ہے

اور مزید نیک اعمال کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے۔

ناجائز راستہ: نعمت تو مل جاتی ہے لیکن اس کے بدلے میں

نیکی کٹ جاتی ہے، اور مزید نیکی عطا نہیں کی جاتی۔ بلکہ

مزید گناہوں کی طرف میلان بڑھ جاتا ہے، جو کہ نقصان ہے۔

اس لیے فرمایا گیا کہ گناہ کے فوراً بعد نیکی کر لو تاکہ نقصان

کا ازالہ ہو سکے اور گناہ کی طرف مزید میلان بھی کم ہو۔

نیکی کے بدلے دنیاوی نعمت کا مل جانا بھی ایک طرح کا خسارہ ہے، کیونکہ دنیاوی بدلہ فانی ہے جبکہ آخرت کا اجر دائمی ہے۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

"میں نہیں چاہتا کہ میری نیکیاں دنیا میں ہی ختم ہو جائیں۔"

لہٰذا جب بھی کوئی نعمت ملے تو شکرانے کے طور پر نیک عمل کرنا چاہیے تاکہ اس نعمت کے بدلے میں جو نیکیاں کٹ گئی ہوں وہ واپس آ جائیں۔

اس نیت سے گناہ کرے کہ اللہ نے مغفور بننے کا موقع دیا ہے نہ

کہ معصوم بننے کا مطالبہ۔ گناہ کے بدلے نیکی کرے اور بہترین

اخلاق و خدمت خلق سے مٹانے کی کوشش کرے۔ اس طرزِ

زندگی سے اللہ کو ہر وقت حاکم مانا جا سکتا ہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم

تقدیر کا مسئلہ:

اتفاق (غیر متوقع/ناگہانی بات) ان کے ساتھ ہوتا ہے جن کے علم

اور طاقت میں کمی ہو، جبکہ اللّٰہ کا علم اور قدرت کامل ہے۔

مثلاً اللّٰہ نے آگ پیدا کی تو یہ نہیں کہ اتفاقاً اس میں حرارت

پیدا ہو گئی ہو یا حرارت کا درجہ خود بخود مقرر ہو گیا ہو۔

چونکہ اللّٰہ کے علم میں کمی نہیں ہے اس لیے اللّٰہ کے ہاں اتفاق

نہیں ہوتا، بلکہ اللّٰہ ہر چیز کا اندازہ مقرر کرتا ہے۔ اسی

اندازے کو تقدیر کہا جاتا ہے۔ ہمارے علم میں کمی ہے اس لیے

ہم بہت سی چیزوں کے بارے میں نہیں جانتے کہ کس چیز کا

کتنا اندازہ مقرر ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تقدیر کو

مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

[25]: وَكُلُّهُمْ يَتَقَلَّبُونَ فِي مَشِيئَتِهِ بَيْنَ فَضْلِهِ وَعَدْلِهِ

ترجمہ: ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق چل رہی

ہے، کبھی فضل و کرم کے ساتھ اور کبھی قانون عدل کے ساتھ۔

(عقیدہ طحاویہ)

جب اللہ کسی چیز کا اندازہ مقرر کرتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے

کہ اس کے علاوہ اندازے پر بھی اللہ قادر ہے، تو اسی کا انتخاب

کیوں کیا؟ اس بارے میں قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ کوئی اللّٰہ سے نہیں پوچھ سکتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے، البتہ اللّٰہ سب سے پوچھے گا۔

نیز سورہ آل عمران (191) میں ارشاد ہے کہ عقل مند لوگ زمین و آسمان کی پیدائش پر غور کر کے کہتے ہیں: "پاک ہے تو! تو نے یہ سب عبث پیدا نہیں کیا۔" یعنی اس میں اللّٰہ کی حکمتیں ہیں۔

اللّٰہ نے لامحدود ممکنات میں سے موجودہ تقدیر کا انتخاب کیا ہے۔ ہم نہ تو ان لامحدود ممکنات کو جانتے ہیں اور نہ ہی اس انتخاب کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے عقلمندی یہ ہے

کہ اللّٰہ سے سوال کرنے کے بجائے، اللّٰہ کے کلام اور ہدایت سے رہنمائی حاصل کی جائے اور تقدیر کو حق سمجھ کر قبول کیا جائے۔ اس بات کو دل میں راسخ کر لینا چاہیے کہ ہر اچھی اور بری تقدیر اللّٰہ ہی کی طرف سے ہے۔

واللّٰہ تعالیٰ أعلم۔

تقدیر کا استعمال

تقدیر کا معاملہ ایسا ہے جیسے موبائل کا استعمال: موبائل کے

اندرونی نظام کو جانے بغیر بھی ہم اسے استعمال کرتے ہیں۔

اسی طرح تقدیر کے اندرونی حقائق کو جانے بغیر بھی ہم

تقدیر کا استعمال معلوم کر کے اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔

تقدیر کو اللہ کے سوا کوئی مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتا،

کیونکہ انسانی عقل محدود ہے۔ اس لیے مخلوق پر لازم ہے کہ

تقدیر کی ان باتوں پر اجمالی ایمان لائے جو قرآن و حدیث

میں آئی ہیں اور بحث و مباحثے سے بچے۔ جیسا کہ احادیث

میں تقدیر پر غیر ضروری جھگڑوں سے منع کیا گیا ہے۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہر اچھی اور بری تقدیر کو اللہ کی

طرف سے مانا جائے۔ اللہ نے ہر چیز کا اندازہ اپنے کامل علم

سے کیا ہے اور مخلوق اپنے علم کی کمی کی وجہ سے ان اندازوں

کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتی۔ ساری خیر اللہ کی طرف سے

ہے، اللہ کی مشیّت کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، لیکن اس کے ساتھ

یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان اپنے گناہوں کا خود قصوروار ہے۔

اس لیے گناہ کرنے کے بعد تقدیر کا سہارا لینا درست نہیں بلکہ

اعتراف جرم کرنا چاہیے، جیسا کہ آدم علیہ السلام نے کیا،

حالانکہ انہوں نے بھول کر میوہ کھایا تھا اور بھولنا بھی

تقدیر کا حصہ ہے۔ البتہ مصیبت کے بعد تقدیر کا سہارا لینا

درست ہے، جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے جنت سے نکلنے کا ذکر کیا۔

اسی طرح تقدیر کا سہارا لے کر تدبیر ترک کرنا درست نہیں۔ بلکہ تدبیر اور تقدیر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ قرآن میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو مختلف دروازوں سے داخل ہونے کی نصیحت کی، لیکن ساتھ ہی اللہ پر توکل کرنے کی تاکید بھی کی۔ اسی طرح ہمیں اپنی کوشش کرنی چاہیے لیکن نتائج کو اللہ کے سپرد کرنا چاہیے۔ یہی توکل ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اگر قیامت قائم ہو جائے اور کسی کے

ہاتھ میں کھجور کا پودا ہو تو وہ اسے لگا دے۔ اس کا مقصد یہ

ہے کہ تقدیر کے نام پر عمل کو نہ چھوڑا جائے۔ تدبیر ترک

کرنا غفلت ہے اور تدبیر پر بھروسہ کرنا شرک کی مشابہت

رکھتا ہے۔ اصل راہ یہ ہے کہ کوشش کی جائے اور اعتمادِ اللہ پر

رکھا جائے۔

ابن ملیکہ رحمہ اللہ نے ایک شخص کو سمجھایا جو بغیر زادِ

راہ کے حج کے لیے نکلتا اور اسے توکل سمجھتا تھا۔ آپ نے

فرمایا کہ تم حقیقت میں جماعت پر بھروسہ کرتے ہو، اللہ پر

نہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ سچا توکل تدبیر کے انکار میں

نہیں بلکہ تدبیر کے بعد اللہ پر مکمل بھروسے میں ہے۔

جب انسان تدبیر کے بعد کامیاب ہو تو کہنا چاہیے: "الحمدللہ،

میں نے فلاں کوشش کی اور اللہ نے کامیابی عطا فرمائی۔"

تاکہ لوگوں کی نظریں اسباب پر نہیں بلکہ اللہ پر رہیں۔ اسی

طرح دوائی کے بارے میں بھی کہنا چاہیے کہ "میں نے یہ دوائی

لی اور اللہ نے شفا دی"۔ دوائی کی تعریف کر کے اللہ کو درمیان

سے نکال دینا اللہ کو پسند نہیں۔

اہلِ علم فرماتے ہیں کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ ہے اور بندے اپنے افعال کو کسب کرتے ہیں۔ اس لیے ہر حال میں دل کو اللہ کی طرف متوجہ رکھنا چاہیے۔

آخر میں خلاصہ یہ ہے کہ:

گناہ کے بعد تقدیر کو بہانہ نہ بناؤ بلکہ اعتراف کرو۔

مصیبت کے بعد تقدیر کو سہارا بناؤ اور صبر کرو۔

تدبیر کو ترک نہ کرو اور نہ ہی اس پر بھروسہ کرو، بلکہ تقدیر اور تدبیر ساتھ ساتھ چلاؤ اور تدبیر میں میانہ روی اختیار کرے۔

ہر کامیابی و خیر کو للہ کی طرف منسوب کرے اور شر کو بطورِ ادب للہ کی طرف منسوب نہ کرے

واللہ تعالیٰ أعلم۔

توکل کا اعلیٰ درجہ

اہلِ علم فرماتے ہیں کہ جائز اسباب اختیار کرکے نتیجہ اللہ کے سپرد کرنا توکل کہلاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک غیر اختیاری اعلیٰ درجہ بھی پایا جاتا ہے جو کبھی کبھار مقربین و اولیاء اللہ کو نصیب ہوتا ہے۔ اس درجے میں ان کی توجہ اسباب سے ہٹ کر بالکلیہ اللہ کی طرف ہو جاتی ہے، بالخصوص جب وہ عبادت اور ذکر میں گہری مشغولیت اختیار کرتے ہیں۔

عام توکل میں بھی اصل توجہ اللہ کی طرف ہی ہوتی ہے، مگر یہ سوچ کے ساتھ کہ اللہ ظاہری اسباب کو ذریعہ بنا کر خیر عطا

فرمائے گا۔ اسی لیے جہاد میں اللہ نے فرشتے بھیجے تاکہ مومنین کے دلوں کو اطمینان ہو، حالانکہ اصل مدد اللہ ہی کی طرف سے تھی۔ کیونکہ انسان کی طبیعت یہ ہے کہ وہ ظاہری اسباب دیکھ کر سکون پاتا ہے۔

مریم رض کو جب بے موسم پھل ملتے تھے تو یہ براہِ راست اللہ کی عطا تھی، لیکن جب حمل کے بعد ان کی توجہ فطری طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ہوئی تو اللہ نے انہیں کھجور کی شاخ ہلانے کا حکم دیا تاکہ اسباب کے ساتھ رزق دیا جائے۔

اسی طرح ابراہیمؑ علیہ السلام جب آگ میں ڈالے گئے تو انہوں نے براہِ راست اللہ سے مدد مانگی اور اللہ نے آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔

اسی طرح ایک روایت ہے۔

مسند احمد

کتاب: حضرت ابوعبید کی حدیث۔

باب: حضرت ابوعبید کی حدیث۔

حدیث نمبر: 15402

ترجمہ:

حضرت ابوعبید سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے نبی

ﷺ کے لئے ایک ہنڈیا میں گوشت پکایا نبی ﷺ نے فرمایا

مجھے اس کی دستی نکال کردو چناچہ میں نے نکال کردی تھوڑی

دیر بعد نبی ﷺ نے دوسری طلب فرمائی میں نے وہ بھی

دیدی تھوڑی دیر بعد نبی ﷺ نے پھر طلب فرمائی میں نے

عرض کیا اے اللہ کے نبی ﷺ ایک بکری کی کتنی دستیاں

ہوتی ہیں نبی ﷺ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے

دست قدرت میں میری جان ہے اگر تم خاموش رہتے تو اس

ہنڈیا سے اس وقت تک دستیاں نکلتی رہتیں جب تک تم اسے

نکالتے رہتے"

یعنی اس لمحے آپ ﷺ کی توجہ خالص اللہ کی طرف تھی،

لیکن صحابی کے کلام سے توجہ اسباب کی طرف منتقل ہو گئی۔

اسی لیے ابن ملیکہ رحمہ اللہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ

اسباب کو ترک کر کے اسے توکل کہا جائے۔ کیونکہ یہ اعلیٰ

درجہ کبھی کبھار اور غیر اختیاری طور پر نصیب ہوتا ہے،

خاص طور پر جب ذکر میں غلبہ ہو۔ ورنہ اصل تعلیم یہی ہے

کہ جیسے موسیٰ علیہ السلام نے سفر کے وقت زادِ راہ لیا اور پھر

اللہ پر توکل کیا، اسی طرح بندے کو بھی تدبیر کے ساتھ توکل

کرنا چاہیے۔

واللہ تعالیٰ أعلم۔

جذباتی اور عقلی صفات

سائیڈ ایفیکٹ (Side Effect) سے مراد نقصان نہیں بلکہ وہ کیفیت ہے جو اصل مقصد کے ساتھ کبھی کبھار اضافی طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ شدت سے محسوس ہوتی ہے اور بعض اوقات بالکل ظاہر نہیں ہوتی۔

اسی تناظر میں قرآن و حدیث میں محبت، نفرت، غصہ وغیرہ کا مطالبہ اصل میں عقلی ہے۔ ان کے تقاضے اللہ نے مقرر فرمائے ہیں۔ جب ان تقاضوں کو عقل کے ذریعے اپنایا جاتا ہے تو کبھی کبھار دل میں ان سے متعلق جذبات بھی بطور سائیڈ ایفیکٹ پیدا ہو جاتے ہیں۔ یوں جذبات کا آغاز عقل سے ہوتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ انسان کے مزاج کا حصہ بن جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر:

اللہ سے محبت کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ بندہ اللہ کو اکیلا حاکم مانے، ﷲ کی تابعداری کرے اور اس کی رضا کے لیے عمل بجا

لائے۔ اس محکومیت اور تابعداری سے کبھی دل میں محبت

کی شدت پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی یہ کیفیت ظاہر ہی نہیں

ہوتی۔

اسی طرح تقویٰ کا مطالبہ عقلی ہے کہ بندہ اللہ کے احکام کی

پیروی کرے۔ اس کے نتیجے میں کبھی دل میں خوفِ الٰہی

شدت سے محسوس ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔

اللہ سے امید کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ نیک اعمال اور دعاؤں کو

ترک نہ کرے، خواہ قبولیت فوری نظر نہ آئے۔

نبی کریم ﷺ سے محبت بھی عقلی تقاضا رکھتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ کو تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ معزز مانا جائے، اللہ کی رضا کے لیے آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجا جائے اور عزت و احترام کے ساتھ ہمیشہ آپ ﷺ کا ذکر کیا جائے۔ اس عقلی محبت کے نتیجے میں کبھی جذباتی محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے، مگر یہ یاد رہے کہ جذباتی محبت یا نفرت بذاتِ خود نہ ثواب کا باعث ہے اور نہ گناہ کا، بلکہ ایک آزمائش ہے۔ امتحان یہ ہے کہ کہیں جذبات میں آ کر نبی ﷺ کو حد سے بڑھا کر پیش نہ کیا جائے یا ان کی محبت کے نام پر خود ساختہ شرعی قوانین نہ گھڑے جائیں۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "مجھے نبی کریم ﷺ سے

شدید (جذباتی) محبت ہے اور خیبر کے یہودیوں سے (جذباتی)

نفرت ہے، لیکن میں نہ نبی کی محبت اور نہ ہی یہودیوں سے

نفرت کی وجہ سے فیصلہ میں بے انصافی کروں گا۔"

البتہ ان جذبات کا فائدہ یہ ہے کہ جب عقلی تقویٰ کے ساتھ دل

میں خوفِ الٰہی پیدا ہوتا ہے تو بندے کو اپنے گناہوں پر رونا

آسان ہو جاتا ہے۔

شیطان بھی اللہ سے ڈرتا ہے جیسا کہ قرآن میں ذکر ہے، اور جنگ

میں اللہ کی مدد دیکھ کر ڈر کے مارے بھاگ گیا تھا۔ مگر

شیطان کا خوف محض جذباتی اور طبعی ہے، جبکہ تقویٰ اور اس

کے عقلی تقاضوں پر وہ عمل نہیں کرتا یعنی للہ کو اکیلا حاکم

نہیں مانتا۔

واللہ تعالیٰ أعلم

صبر اور شکر

انسان پر اللہ کی طرف سے ہمیشہ نعمتیں نازل ہوتی رہتی ہیں،

لیکن انسان کی کیفیت دو طرح کی ہوتی ہے:

1. کبھی وہ خود کو بلیسڈ (blessed) محسوس کرتا ہے۔

2. کبھی ان بلیسڈ (unblessed) محسوس کرتا ہے۔

پہلی حالت میں اللہ کی تابعداری کو شکر کہا جاتا ہے، اور

دوسری حالت میں اسی تابعداری کو صبر کہا جاتا ہے۔

اللہ کا مطالبہ یہ ہے کہ بندہ دونوں حالتوں میں اس کی

تابعداری کرے، یعنی شکر اور صبر دونوں ادا کرے۔

بعض اہل علم نے کہا ہے کہ عبادت صرف اس وقت عبادت ہے

جب وہ شوق اور محبت (یعنی جذبات) کے ساتھ کی جائے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ عبادت کا اصل تقاضا عقلی محبت ہے،

یعنی للہ کو اکیلا حاکم ماننا، اللہ کے حکم کی پیروی کرنا۔

جذبات بذاتِ خود امتحان ہیں، جبکہ اللہ نے عقلی محبت،

نفرت اور خوف کو لازم قرار دیا ہے۔ جب بندہ عقلی تقاضے

پورے کرتا ہے تو کبھی دل میں محبت اور خوف بھی بطور

جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، مگر یہ ہر وقت نہیں ہوتے۔ اس

لیے بعض اہل علم کو اجتہادی خطا لاحق ہوئی۔

قرآنی دلائل (مفہوم کی شکل میں)

الف) قرآن میں مذمت کرتے ہوئے اللہ فرماتا ہے کہ جب

انسان کو نعمت ملتی ہے تو خوش ہو کر عبادت کرتا ہے، اور جب

مصیبت آتی ہے تو عبادت چھوڑ دیتا ہے۔ ایسے لوگ دراصل دنیا

کی نعمتوں میں اٹکے رہتے ہیں۔

ب) ایک اور جگہ فرمایا کہ جب انسان مصیبت میں ہوتا ہے

تو اللہ کو پکارنے لگتا ہے، لیکن جیسے ہی مصیبت ٹلتی ہے

عبادت چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بھی دنیا کی نعمتوں میں اٹکے رہنے کی

علامت ہے۔

اس کے برعکس مومن ہر حالت میں اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

البتہ مصیبت میں انبیاء علیہم السلام بھی زیادہ متوجہ ہوتے

تھے، لیکن راحت کے وقت اللہ کو بالکل بھولتے نہیں تھے۔

حدیثی دلیل

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے کہا: "مجھے اسلام پسند نہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اسلام پھر بھی قبول کر، چاہے تمہیں پسند نہ ہو۔"

اس سے معلوم ہوا کہ عبادت صرف جذباتی محبت سے مشروط نہیں، بلکہ عقلی اطاعت ہی اصل ہے۔ دل کے جذبات بے اختیار ہوتے ہیں اور ان پر انسان کا مکمل کنٹرول نہیں، اس لیے یہ آزمائش ہیں۔ مومن کی پسند جنت جیسی زندگی ہے اور وہ عقلی طور پر جانتا ہے کہ اسلام پر چل کر ہی جنت میں داخلہ ممکن ہے۔

صبر کی اہمیت

انسان کا زیادہ واسطہ صبر سے پڑتا ہے، کیونکہ ہر کوئی جنت جیسی راحت چاہتا ہے۔ اس لیے صبر تین پہلوؤں پر ہوتا ہے:

1. اللہ کی اطاعت پر صبر۔

2. اللہ کی نافرمانی سے بچنے پر صبر۔

3. دنیا کی تکالیف اور مصیبتوں پر صبر، یعنی اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کی تابعداری جاری رکھنا۔

صبر کا اجر شکر سے بڑھ کر ہے، کیونکہ صبر میں نفس کے خلاف جہاد شامل ہے، دل پر بوجھ ڈالنا پڑتا ہے، اور تکالیف پر گناہ بھی معاف ہوتے ہیں۔

صبر اور شکر کو جمع کرنا

ایک ہی عمل میں صبر اور شکر دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔

مگر صبر اور شکر کے طریقے خود سے ایجاد نہیں کیے جا سکتے،

بلکہ وہی معتبر ہیں جو اللہ نے مقرر فرمائے ہیں۔

شکر کے طریقے

اللہ نے شکر ادا کرنے کا طریقہ قرآن و حدیث میں بتایا ہے۔

مثلاً:

پانی پی کر "الحمد للہ" کہنا، اللہ کا شکر ہے۔

اگر کوئی انسان تمہاری مدد کرے تو اللہ کا شکر یہ ہے کہ اس انسان کے احسان کا بدلہ لوٹاؤ۔ اگر بدلہ دینے کی طاقت نہ ہو تو اتنی دعائیں کرو کہ دل مطمئن ہو جائے کہ احسان کا حق ادا ہو گیا۔

نبی ﷺ نے فرمایا: "جو بندوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا۔"

بندوں کا شکر ادا کرنے کے طریقے

1. اپنی استطاعت کے مطابق بدلہ دینا۔

2. اگر بدلہ نہیں دے سکتے تو دل مطمئن ہونے تک دعائیں دینا۔

3. ذکرِ خیر کرنا، مثلاً محمد بن قاسمؒ کے ذریعے اللہ نے ہندوستان میں اسلام پھیلایا، تو ان کے لیے دعا اور ذکر خیر کرنا۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے ذریعے ہم تک اسلام پہنچا، تو ان کا شکر قرآن و حدیث کے مطابق ادا کرنا۔

خود سے ایجاد کردہ شکر یا صبر کے طریقے اللہ کو منظور نہیں

ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"جو تمہارے ساتھ بھلائی کرے، تم اس کا بدلہ دو، اگر بدلہ

دینے کے لیے کچھ نہ پاؤ تو اس کے لیے (اس قدر) دعا کرو یہاں

تک کہ تمہیں لگے کہ تم نے بدلہ چکا دیا۔"

حوالہ: سنن ابو داؤد – 1672

رسول للہ ﷺ نے فرمایا:

جس پر کسی نے احسان کیا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس کا بدلہ
اتارے

اگر بدلہ اتارنے کی طاقت نہ رکھے تو احسان کرنے والے کا اچھے
الفاظ میں ذکر کرے

مسند احمد 23496

واللہ تعالیٰ أعلم

اللہ سے ناامیدی

ناامیدی دو طرح کی ہے:

1. بے اختیار یا جذباتی ناامیدی، جو دل میں اچانک پیدا ہونے والے وساوس کی صورت میں آتی ہے۔

2. اختیاری ناامیدی، جس پر انسان کا اختیار ہوتا ہے۔

پہلی قسم یعنی جذباتی ناامیدی میں یہ وساوس دل میں آتے ہیں کہ "اللہ ہماری مدد نہیں کرے گا، ہماری نیکیاں قبول نہیں کرے گا، ہماری دعائیں رد ہو جائیں گی، ہمیں معاف نہیں کرے گا" وغیرہ۔ یہ وساوس چونکہ بے اختیار ہوتے ہیں، اس لیے ان پر اللہ کی پکڑ نہیں ہے۔ قرآن میں بھی ارشاد ہے

کہ مفہوم: ''اللّٰہ کسی جان کو اس کی استطاعت سے بڑھ کر

مکلف نہیں کرتا'' (البقرہ– 286)۔ البتہ ان وساوس کے تقاضے

ہوتے ہیں، جیسے عبادت چھوڑ دینا یا بدگمانی پر عمل کرنا؛

ان پر عمل نہ کرنا واجب ہے۔

دوسری قسم اختیاری ناامیدی ہے۔ اگر انسان ان وساوس کے

تقاضوں کو اختیار کرے اور اس بنیاد پر نیک اعمال چھوڑ

دے کہ ''اللّٰہ انہیں قبول نہیں کرے گا'' تو یہ کبیرہ گناہ ہے۔

قرآن میں اس طرح کی ناامیدی کو کافروں کی صفت قرار دیا

گیا ہے (یوسف 87)۔ اسی طرح دعا اور مغفرت مانگنے کو اس

سوچ سے ترک کرنا کہ ''اللّٰہ ویسے بھی قبول نہیں کرے گا''

بھی اختیاری ناامیدی ہے اور یہ موجبِ پکڑ ہے۔ قرآن میں

فرمایا گیا ہے: مفہوم: جو شخص دعا کرنے سے منہ موڑے گا،

اللہ اسے جہنم میں داخل کرے گا۔ (غافر 60)

دعا مانگنے کے دو طریقے ہیں:

1. اسمائے حسنیٰ کے ذریعے، جیسے "یا اللہ"، "یا رحمن"۔

(اعراف 180)

2. نیک اعمال کو وسیلہ بنا کر، جیسے نماز، روزہ، خدمتِ خلق وغیرہ کے صدقے حاجت طلب کرنا۔

صحیح البخاری: حدیث نمبر 5974

صحیح مسلم: حدیث نمبر 2743

اصل حقیقت یہ ہے کہ دعا ہی عبادت کا مغز ہے۔ کیونکہ دعا میں انسان اپنی بے بسی کا سب سے اعلیٰ درجے میں اظہار کرتا ہے اور اپنے تمام ہتھیار اللہ کے سامنے ڈال دیتا ہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم۔

اللہ کی صفات اور ذات کے بارے میں غلط اور صحیح اصول

بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں دو قاعدے بیان کیے

ہیں، مگر یہ دونوں قاعدے مرجوح (کمزور) ہیں:

بیان کردہ قاعدے

1. جہاں صفت ہو وہاں ذات لازماً ہوگی۔

2. جو چیز مخلوق میں پائی جاتی ہے اسے اللہ سے نفی کیا جائے گی۔

مرجوح ہونے کی وجوہات

1. صفت اور ذات کے فرق کی وضاحت

اگر کوئی شخص اپنے کمرے میں بیٹھ کر ٹی وی پر لندن کی خبر دیکھ رہا ہے تو وہ ذات کے اعتبار سے کمرے میں ہے اور علم کے اعتبار سے لندن میں۔

اسی طرح صحیح علم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علم کے اعتبار سے ہر جگہ موجود ہے، جبکہ ذات کے اعتبار سے عرش پر مستوی ہے جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔ اس استواء کی نہ ہم کوئی کیفیت بیان کریں گے، نہ اس کی تشریح کریں گے، اور نہ اسے مخلوق کے مشابہ قرار دیں گے۔

2. صفات کی نفی کا باطل اصول

اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ جو چیز مخلوق میں ہو اسے اللہ

سے نفی کر دی جائے تو پھر مخلوق میں "رحم" موجود ہے، لہٰذا

اللہ سے بھی رحم کی نفی کرنا پڑے گا۔ حالانکہ یہ درست

نہیں۔

بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ مخلوق کا رحم محدود اور ادھورا ہے

جو اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، جبکہ اللہ کا رحم کامل اور بے

حد و بے حساب ہے۔

اسی طرح قرآن و حدیث میں اللہ نے اپنے لیے "ہاتھ"،

"آنکھیں"، "پاؤں" وغیرہ بیان فرمائے ہیں۔ سلف نے ان کی

تشریح یوں کی ہے:

اللہ کا ہاتھ ویسا ہی ہے جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔

نہ ہم اس کے بارے میں خاکے بنائیں گے۔

نہ کیفیت بیان کریں گے۔

اور نہ اسے مخلوق کے مشابہ قرار دیں گے۔

اسی طرح اللہ کا وجود بھی ایسا ہی ہے کہ ہم صرف اتنا کہتے ہیں

کہ اللہ کا وجود اس کی شان کے لائق ہے، کیفیت ہمیں معلوم

نہیں۔

اہل علم کا اصول

اہل علم کا کہنا ہے کہ:

جو کچھ اللہ نے اپنی ذات کے لیے ثابت کیا ہے، ہم بھی وہی ثابت

کرتے ہیں۔

اور جس چیز کی نفی اللہ نے خود کی ہے، ہم بھی اس کی نفی کرتے

ہیں۔

غور و فکر کی اصل راہ

اللہ کی ذات ہم سے پوشیدہ ہے، اس بارے میں ہمیں خاکے نہیں

بنانے چاہئیں۔ البتہ اللہ کی صفات میں غور و فکر کرنا

چاہیے۔

یہاں تک کہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی اللہ کی انفرادی

صفت کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتے۔ انسان کو اتنا ضرور

جاننا چاہیے کہ عبادت کے مفہوم کو سمجھ کر اس نتیجے پر

پہنچے کہ:

اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔

اور اس یقین کے ساتھ شرک سے پاک زندگی گزارے۔

نوٹ

عرش پر استواء کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ نے کائنات کے

نظام کے اختیارات اپنے پاس رکھے ہیں، کسی کو عطا نہیں

کیے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

قرآن اور حدیث: ہدایت کے دو سرچشمے

قرآن اور حدیث کا تعلق

قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

احادیث یعنی نبی کریم ﷺ کی سنت اور ارشادات بھی اللہ ہی

کی طرف سے ہیں۔

احادیث قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے بنیادی

ذریعہ ہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب

پوچھا گیا کہ نبی کریم ﷺ کے اخلاق کیسے تھے؟ تو انہوں

نے فرمایا:

"کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ نبی کریم ﷺ کے اخلاق تو

قرآن ہی تھے۔"

صحیح مسلم 746

گویا نبی ﷺ کی پوری زندگی قرآن کا عملی نمونہ تھی۔

دو طرح کے قرآن

اہل علم کہتے ہیں:

ایک قرآن وہ ہے جو صحیفوں میں موجود ہے۔

دوسرا قرآن وہ ہے جو نبی ﷺ کی عملی زندگی میں ظاہر ہوا۔

اسی لیے سوال اٹھتا ہے کہ ہم قرآن پر کیسے عمل کریں؟

تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جیسے نبی ﷺ قرآن پر عمل

کرتے ہیں، ویسے ہی تم بھی کرو، بلا کسی شرط یا قید کے۔

یہاں تک کہ اگر بالفرض نبی ﷺ سے اجتہادی خطا بھی

سرزد ہو تو بھی چونکہ اللہ نے آپ ﷺ کی پیروی کا حکم دیا

ہے، اس پر عمل کرنے والے کو ثواب ملے گا۔

عملی طریقۂ تعلیم

اللہ تعالیٰ کے احکام کو عملی طور پر سکھانے کا سب سے بہترین

طریقہ یہی تھا کہ انبیاء علیہم السلام کو نمونہ بنا کر بھیجا

جائے، تاکہ لوگ ان سے نقل کریں جیسا وہ شریعت پر عمل

کرتے ہیں۔

دین اور دنیا کے معاملات میں فرق

دنیاوی امور: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "تم دنیا کے

معاملات کو زیادہ جانتے ہو" (جیسے کھیتی باڑی یا آج کے دور

میں موبائل بنانا وغیرہ)۔

صحیح مسلم 2363

دینی امور: دین میں نبی کریم ﷺ کی اطاعت مطلق ہے۔

صحابہ کرام کی پیروی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مغفور ہیں لیکن معصوم نہیں۔

اس لیے ان کے گناہوں اور اجتہادی خطا پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

البتہ اگر کسی کو کسی صحابی کی اجتہادی خطا کا علم نہ ہو اور وہ اس پر عمل کرے تو اللہ کے حکم سے اسے بھی ثواب ملے گا۔

میری تحقیق کے مطابق:

صحابی کا قول یا فعل حجت ہے جب تک کسی شخص کو یہ

معلوم نہ ہو کہ یہ خطا ہے۔

اگر اسے معلوم ہو جائے تو پھر اجتناب واجب ہے۔

اور جنہیں معلوم ہے وہ دوسرے فرد کو گمراہ قرار نہ دیں

کیونکہ اللہ اس کو نیت کے مطابق اجر دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

جب کوئی حاکم فیصلہ کرے اور اجتہاد (حقیقت کو سمجھنے کی بھرپور کوشش) کرے ، پھر وہ حق بجانب ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور جب وہ فیصلہ کرے اور اجتہاد کرے ، پھر وہ (فیصلے میں) غلطی کر جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے ۔

صحیح مسلم 1716

صحیح البخاری 7352

مثال:

جس کو رفع الیدین (نماز میں ہاتھ اٹھانا) منسوخ لگتا ہے،

اسے اس رائے پر ثواب ملے گا۔

اور جسے منسوخ نہیں لگتا، اسے رفع الیدین کرنے پر ثواب ملے

گا۔

دونوں کو ثواب مل رہا ہے، اس لیے ایک دوسرے کو "گمراہ"

کہنا جہالت ہے۔

تابعین اور بعد کے علماء کی پیروی

غیر صحابی (تابعین وغیرہ) کی رائے پر عمل اسی وقت کیا جائے گا جب یہ بات واضح ہو کہ ان کی بات قرآن یا حدیث پر مبنی ہے۔

یہ گویا اجتہاد میں ایک طرح کی تائید اور احتیاط ہے تاکہ بڑی غلطی سے بچا جا سکے۔

ایک اہم قاعدہ

یاد رکھیں:

حق سے ضد اور عناد کی بنا پر انکار یہودیت اور نصرانیت سے

بھی زیادہ خطرناک ہے۔

ہمیشہ "طالبِ حق" بنے رہیں، اور جب حق واضح ہو جائے تو

بلا تاخیر تسلیم کریں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

بدعت سے بچنے کا طریقہ

بدعت سے بچنے کا اصول یہ ہے کہ شریعت (قرآن و حدیث) میں جن فرائض اور نوافل کا وقت اور تعداد مقرر ہے، ان کو اسی طرح مقرر کرنا لازم ہے۔ اور جن نوافل کا وقت اور تعداد مقرر نہیں ہے، ان کو اپنے طور پر کسی خاص فضیلت کی نیت سے مقرر کرنا بدعت کے زمرے میں آتا ہے۔

مثالیں:

1. عام نوافل کی فضیلت ہر وقت ہے۔ اگر کوئی شخص دوپہر 3 بجے یہ نفل اس نیت سے ادا کرے کہ یہ وقت دوسرے اوقات سے زیادہ فضیلت والا ہے، تو چونکہ یہ فضیلت حدیث میں نہیں آئی، لہٰذا یہ عمل بدعت ہوگا۔

لیکن اگر کوئی یہ نیت کرے کہ میں فارغ اسی وقت ہوتا ہوں، کسی خاص فضیلت کی نیت نہیں ہے تو یہ جائز ہے۔

2. ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ کسی بھی دن کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص تیسرے دن کو دوسرے دنوں پر فضیلت

دے، تو چونکہ قرآن و حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے، یہ بدعت

ہو گا۔

البتہ اگر اتفاقاً تیسرے دن صدقہ کر رہا ہے اور کوئی فضیلت

نہیں سمجھ رہا تو یہ درست ہے۔

3. اذکار اور دعائیں: جن اذکار کی تعداد نبی ﷺ نے مقرر

فرمائی ہے، ان پر عمل کرتے وقت تعداد کا لحاظ ضروری ہے۔

اگر اپنی طرف سے اس میں اضافہ یا کمی کی جائے اور اسے

زیادہ فضیلت والا سمجھا جائے تو یہ بھی بدعت ہو گا۔

جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

"جس نے ہمارے دین میں کوئی نیا عمل ایجاد کیا جو اس

میں سے نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔"

📖 صحیح بخاری، حدیث 2697 | صحیح مسلم، حدیث

1718

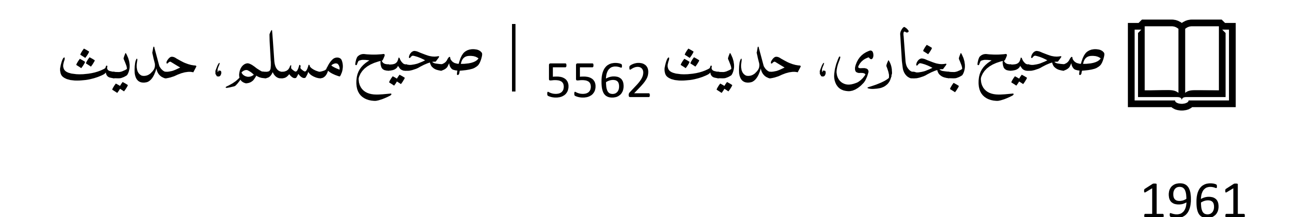
4. قربانی کی مثال: ایک صحابی نے عید کی نماز سے پہلے

قربانی کی اس نیت سے کہ غریبوں کو جلدی کھلایا جائے۔ نبی

کریم ﷺ نے فرمایا:

"یہ تمہارے لیے محض گوشت ہے (قربانی نہیں بنی)" اور انہیں

دوبارہ قربانی کرنے کا حکم دیا۔



صحیح بخاری، حدیث 5562 | صحیح مسلم، حدیث 1961

یعنی نبی ﷺ کے زمانے میں بعض نیک نیت اعمال بھی،

اگر وہ شریعت کے مقررہ طریقے کے خلاف ہوں، تو وہ مردود

قرار دیے گئے۔ یہی بدعت کی بنیاد ہے۔

خلاصہ

وقت اور تعداد شریعت نے جہاں مقرر کی ہے، وہاں پابندی لازمی ہے۔

جہاں مقرر نہیں ہے، وہاں اپنی سہولت کے مطابق عمل جائز ہے، لیکن فضیلت سمجھ کر کوئی نئی تعیین کرنا بدعت ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

سنت کی تعریف اور فقہ

سنت کی تعریف

لغوی معنی: "سنت" لغت میں طریقہ یا راہ کو کہتے ہیں۔

اصطلاحِ شریعت میں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

طریقۂ کار کو سنت کہا جاتا ہے۔ یا وہ تمام نیک اعمال جو

قرآن و حدیث سے ثابت ہوں، وہ سنت ہیں۔

سنت کی اقسام (شریعت کے اعتبار سے)

1. فرض یا واجب: جس کے ترک سے مومن گناہگار ہو جاتا ہے۔ (شریعت میں فرض اور واجب میں فرق نہیں، البتہ فقہ میں فرق کیا جاتا ہے۔)

2. نفل: جس کے کرنے سے ثواب ہے، لیکن چھوڑنے سے گناہ نہیں۔

فقہ کی تعریف

فقہ دراصل شریعت کی انسانی سمجھ ہے۔

یعنی فقہاء قرآن و حدیث کی نصوص کو سامنے رکھ کر غور

کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مقصد کیا ہے، پھر اس پر

دلائل قائم کرتے ہیں اور ایک منظم فہم پیش کرتے ہیں۔

فقہ میں تقسیمات

1. فرض اور واجب

فرض: جو دلیل قطعی (یقینی دلیل) سے ثابت ہو۔ اس کے ترک کرنے والا گناہگار ہے۔

واجب: جو دلیل غالب گمان سے ثابت ہو۔ اس کے ترک کرنے والا یقینی گناہگار نہیں، لیکن گناہ کا اندیشہ رہتا ہے۔ احتیاط یہی ہے کہ اسے ترک نہ کیا جائے۔

2. نفل کی تقسیم

سنت مؤکدہ: وہ نوافل جن پر نبی ﷺ ہمیشہ عمل کرتے رہے، ثواب کی حرص میں۔ ان کو ترک کرنے والا گناہگار تو نہیں، لیکن ملامت کے لائق ہوتا ہے۔

سنت غیر مؤکدہ: وہ نوافل جو نبی ﷺ نے کبھی کبھار کیے، یا صرف ترغیب دی، یا صحابہ نے کیے اور آپ ﷺ نے منع نہ فرمایا۔

3. حرام اور مکروہ

حرام: جو یقینی دلیل سے منع ہو۔ اس کا کرنے والا گناہگار ہوتا ہے۔

مکروہ تحریمی: جو غالب گمان سے منع ہو۔ اس کا کرنے والا یقینی گناہگار نہیں، مگر احتیاط یہی ہے کہ پرہیز کرے۔

مکروہ تنزیہی: جو حلال کے قریب ہو۔ اس سے بچنا بہتر ہے لیکن کرنے والا گناہگار نہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی اصطلاحات

میری تحقیق کے مطابق، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جب کسی

عمل کو مطلق سنت کہتے ہیں تو اس سے مراد سنت مؤکدہ ہوتی

ہے یا وہ نفل جو نبی ﷺ نے بذاتِ خود کیا ہو۔

اور جب کسی نفل کو "مستحب" کہتے ہیں تو اس سے مراد عام

نفل ہوتا ہے۔

دیگر ائمہ کے ہاں تعریفات اور تعبیرات مختلف ہوسکتی ہیں،

مگر مقصد قریب قریب ایک ہی ہے۔

واجب اور مکروہ تحریمی کا فائدہ

نبی ﷺ نے فرمایا:

"حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے، اور ان کے درمیان کچھ

مشتبہ چیزیں ہیں۔ جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچے گا وہ اپنے

دین اور اپنی عزت کو محفوظ رکھے گا۔"

📖 صحیح بخاری، حدیث 52 | صحیح مسلم، حدیث 1599

اہل علم نے ایک اصول بیان کیا ہے:

"حسنات الابرار سیئات المقربین"

یعنی عام لوگوں کی نیکیاں، مقربین کے لیے (کمال درجے کے مقابلے میں) کوتاہی شمار ہوتی ہیں۔

مثال: حضرت آدم علیہ السلام نے شیطان کی جھوٹی قسم پر اعتبار کرلیا، حالانکہ جنت میں ہمیشہ رہنے کی خواہش بذاتِ خود بری نہ تھی۔ مگر چونکہ وہ مقربین میں سے تھے، اس لیے

اللہ تعالیٰ نے ان پر بھی گرفت کی، جب انہوں نے بھولے سے میوہ کھایا۔

🕮 سورۃ الاعراف (7:20–22)، سورۃ طٰہٰ (20:115)

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی مثال: ایک شخص پر آپ کا قرض تھا۔ جب آپ اس کے دروازے پر کام سے گئے تو دھوپ میں کھڑے ہو گئے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے گھر کی دیوار کا سایہ استعمال کرنے سے بلا معاوضہ فائدہ سود کے مشابہ نہ شمار ہوجائے۔ یہ یقینی سود نہیں تھا، مگر آپ نے مکروہ تحریمی کے درجے کی احتیاط اختیار فرمائی۔

نتیجہ

واجب اور مکروہ تحریمی کی فقہی تقسیم کا مقصد یہ ہے کہ اہل ایمان کو زیادہ سے زیادہ احتیاط پر عمل کرنے کی ترغیب دی جائے، تاکہ وہ مشتبہ امور سے بھی بچیں اور مقربین کے طریقے پر چلنے کی کوشش کریں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

فقہ کا مسئلہ اور میرا ذاتی اصول

میری سمجھ کے مطابق قرآن و حدیث ہی شریعت ہیں، اور ان کی اصل وہی ہے جو نبی کریم ﷺ کی سنت سے ثابت ہو۔ باقی تمام تفاسیر، فقہی آراء اور علماء کی باتیں شریعت کی انسانی سمجھ ہیں، جو صحیح بھی ہو سکتی ہیں اور غلط بھی۔

میرا ذاتی اصول یہ ہے:

صحابی کا قول و فعل تب تک حجت ہے جب تک مجھے معلوم

نہ ہو کہ وہ قرآن و حدیث کے خلاف ہیں۔

اور غیر صحابی کا قول و فعل تب حجت ہے جب مجھے معلوم ہو

کہ وہ قرآن و حدیث کے موافق ہیں۔

فقہ کا مطلب ہے شریعت کے منشا اور مقصد کو سمجھنے کی کوشش۔ اس لئے فقہ بذاتِ خود شریعت نہیں، بلکہ شریعت کی انسانی فہم ہے۔ صحابہ کرام جب کسی مسئلے پر متفق ہو جائیں تو اسے اجماع کہا جاتا ہے، اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہی شریعت کا یقینی منشا ہے۔ اسی لیے اجماع صحابہ کی مخالفت کو کفر کہا گیا ہے، کیونکہ حقیقت میں یہ مخالفت فقہ کی نہیں بلکہ شریعت کی مخالفت ہے۔ البتہ اگر کسی کو علم یقینی نہ ہو کہ یہ اجماع ہے تو وہ عند اللہ کافر نہیں۔

راجح اور مرجوح (مضبوط اور کمزور فہم) میں اختلاف صحابہ کے درمیان بھی تھا، تابعین کے درمیان بھی اور استاد و

شاگرد کے درمیان بھی۔ لیکن انہوں نے کبھی تعصب یا دشمنی

نہیں کی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ شریعت کا حصہ ہے کہ

کسی کو ایک فہم راجح لگتا ہے اور کسی کو دوسرا۔

اہل علم نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر کسی کے سامنے ایک بات

سورج کی روشنی کی طرح واضح ہو جائے کہ یہی قرآن و حدیث

کا منشا ہے، پھر بھی وہ تعصب، وراثتی اندھی تقلید یا جذبات

کی وجہ سے مرجوح کو اختیار کرے تو یہ عمل کفر کی حد تک

خطرناک ہے۔ لیکن اگر کسی کو شک یا غالب گمان ہو اور وہ

کسی مجتہد کی رائے پر اعتماد کر لے تو یہ کفر نہیں۔

میری رائے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ فقہ حنفی، شافعی وغیرہ سب دراصل شریعت کی تفہیم کے نام ہیں۔ ان کو خود شریعت کہنا یا ان کو شریعت کے برابر سمجھنا خطرناک بات ہے۔ ان کی حیثیت صرف انسانی فہم ہے جو اصولوں پر مبنی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی شریعت فہمی کو ''فقہ ابن عباس'' کہا جا سکتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

کرنسی کا مقصد اور ہماری ذمہ داری

اللہ تعالیٰ نے انسان کو کرنسی عطا کی تاکہ وہ اپنی خواہشات

کو قابو میں رکھ سکے، وسائل کو فضول خرچ سے بچا سکے، اور

زندگی کے ضروری تقاضے پورے کر سکے۔ کرنسی کا اصل

مقصد یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعے جائز اور ضروری خدمات

لے۔

لیکن جب کرنسی کا مقصد فوت ہو جائے تو فساد پیدا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جوا، سود، رشوت اور ناچ گانے کے ذریعے کمانے

کو حرام قرار دیا گیا، کیونکہ ان ذرائع سے کرنسی حاصل تو

ہوتی ہے لیکن کوئی حقیقی اور ضروری خدمت انجام نہیں دی

جاتی۔

اگر اللہ پاکستان پر آسمان سے ڈالر برسا دے تو ہمارے موجودہ

کردار کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ہم اس کا مقصد کھو

بیٹھیں گے۔ ہم ان ڈالرز سے اپنی زمین کو آباد کرنے کے

بجائے دوسرے ممالک سے وسائل درآمد کریں گے، اور یوں

دنیا میں نئے بحران پیدا ہوں گے۔

یاد رکھیں! ضروری خدمات میں سب سے اہم زمین داری اور زراعت ہے، کیونکہ اسی سے معاشرے کی بنیادی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

حکومت کی ذمہ داری

حکومت پر لازم ہے کہ ہر پالیسی میں کرنسی کے اصل مقصد کو ملحوظ رکھے:

1. انسان سے غیر ضروری خدمات لینے کے بجائے ضروری خدمات لی جائیں۔

مثال کے طور پر اگر فوج کی 60 تعداد سے ملکی حفاظت ممکن ہے تو باقی کو زراعت اور زمین داری جیسے کاموں پر لگایا جائے تاکہ قومی پیداوار میں اضافہ ہو۔

2. بجلی اور توانائی کے وسائل غیر ضروری کارخانوں پر ضائع کرنے کے بجائے پانی، زراعت اور دیگر ضروریات پر صرف کیے جائیں۔

لیکن آج کا مسئلہ یہ ہے کہ اکثر حکمران صرف ذاتی مفاد سوچتے ہیں۔ انہیں اپنی جیب اور اپنی تنخواہ کی فکر ہوتی ہے، قوم اور آخرت کی نہیں۔ وہ شارٹ کٹ ڈھونڈتے ہیں: پیداوار بڑھانے کے بجائے ٹیکس بڑھا دیتے ہیں اور وسائل برآمد کر کے قومی خزانہ بھرتے ہیں تاکہ اپنی تنخواہ یقینی بنائیں۔

نصیحت

اگر ہم اللہ کے قوانین کو غور سے دیکھیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں کرنسی کا اصل مقصد ہمیشہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اس لیے قرآن و حدیث کے مطابق صحیح اور حکمت کے ساتھ

نظام نافذ کرنا علماء حق پر فرضِ کفایہ ہے۔

یہ یاد رہے کہ قوانین نافذ کرنے کے لیے صرف جذبات کافی نہیں

بلکہ علم اور حکمت ضروری ہیں۔ کہاں سختی کرنی ہے اور

کہاں نرمی، یہ وہ بصیرت ہے جو قرآن و حدیث پر علم اور

عمل سے نصیب ہوتی ہے۔

پس جو حکمران اور اہل علم آخرت کو یاد رکھیں گے وہ

کرنسی کو اس کے مقصد کے مطابق استعمال کریں گے، اور جو

صرف دنیا کے پیچھے ہوں گے وہ اسے فساد کا ذریعہ بنا دیں گے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

اللّٰہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے

اللّٰہ تعالیٰ الرحمٰن الرّحیم اور ارحم الراحمین ہے۔ وہ اپنے بندوں سے ماں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے، اور اس کی حقیقت و مقدار صرف اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

لہٰذا ہمیشہ اللہ سے امیدیں وابستہ رکھنی چاہییں، کیونکہ وہ دعا کرنے والے سے راضی ہوتا ہے اور اپنے بندوں کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے۔

صحیح احادیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"اللہ اپنے بندوں پر ماں سے بھی زیادہ مہربان ہے۔"

(بخاری: 5999، مسلم: 2754، 2755)

تابعی محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"اگر قیامت کے دن مجھے یہ اختیار دیا جائے کہ میرا حساب

میرے والدین کریں یا اللہ، تو میں کہوں گا کہ والدین حساب

نہ کریں بلکہ اللہ کریں، کیونکہ اللہ ارحم الراحمین ہے۔"

واللہ تعالیٰ اعلم

موت کو طبعی ناپسند کرنا

موت ہر انسان کو فطری طور پر ناپسند ہے۔ مگر عقل مندی یہ ہے کہ جب مرنا بہرحال یقینی ہے تو ایسی موت کی کوشش کی جائے جس پر اللہ راضی ہو۔ اسی لیے مومن شہادت کی موت کی آرزو کرتا ہے، کیونکہ شہادت پر اللہ کی رضا یقینی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :‘‘ جو شخص مر گیا اور جہاد کیا نہ دل میں جہاد کا ارادہ ہی کیا ، وہ نفاق کی ایک قسم میں مرا ۔’’ صحیح مسلم 1910

اس کا مطلب یہ ہے کہ منافق کو اللہ کی رضا مندی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس لیے وہ شہادت کی تمنا کیوں کرے؟

اسی طرح مسجد حرام اور مسجد نبوی میں نماز کا ثواب کئی گنا بڑھا دیا گیا ہے (مسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کے برابر اور مسجد نبوی میں ہزار کے برابر)۔ چونکہ مومن کا مقصود اللہ کی رضا ہے، اس لیے اتنا عظیم ثواب دیکھ کر اس کا دل لازماً مکہ اور مدینہ کی طرف کھنچتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"میری مسجد میں نماز مسجد حرام کے سوا کسی بھی مسجد

کی ہزاروں نمازوں سے افضل ہے ۔ اور مسجد حرام میں ایک

نماز پڑھنا کسی دوسری مسجد کی ایک لاکھ نمازوں سے افضل

ہے ۔ ‘‘

ابن ماجہ 1406

میری اس مسجد میں ایک نماز دوسری مسجدوں میں ایک

ہزار نمازوں سے افضل ہے ، سوائے مسجد حرام کے ۔‘‘

صحیح مسلم 1394

صحیح البخاری 1190

واللہ تعالیٰ اعلم

عقلی خوف اور تقویٰ

قرآن و حدیث میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ اگر فلاں عمل کرو
گے تو یہ نقصان ہوگا، تو اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اگر تم
فلاں عمل کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دے گا۔ اس کا
مطلب یہ ہے کہ عمل میں بذاتِ خود کوئی اثر نہیں ہوتا، بلکہ
اصل اثر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔

اس طرح مومن کا خوف براہِ راست اللہ سے وابستہ ہوتا ہے۔
تقویٰ کا حقیقی تصور یہ ہے کہ انسان یہ سوچ کر گناہ سے بچے کہ
اللہ تعالیٰ سزا دینے پر قادر ہے۔ اگرچہ جذباتی کیفیت میں بعض
اوقات انسان کو خود عمل سے بھی خوف محسوس ہوتا ہے،

لیکن عقل اور ایمان کی بنیاد پر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ سزا

دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

کہ ایک بندے نے بہت گناہ کئے اور کہا : اے میرے رب !

میں تیرا ہی گنہگار بندہ ہوں تو مجھے بخش دے ۔ اللہ رب

العزت نے فرمایا : میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب

ضرور ہے جو گناہ معاف کرتا ہے اور گناہ کی وجہ سے سزا بھی دیتا

ہے میں نے اپنے بندے کو بخش دیا

صحیح البخاری – 7507

صحیح مسلم 2758

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ مومن بندے کا عقیدہ یہ ہوتا

ہے کہ گناہ بذاتِ خود سزا نہیں دیتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ اگر

اللہ معاف کر دے تو گناہ کا برا اثر ختم ہو جاتا ہے اللہ کے فضل

سے۔ بلکہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ گناہ کے برے اثر کو بھی نیکی

میں بدل دیتا ہے، جیسا کہ قرآن میں فرمایا:

" ﴿فَأُوْلَٰٓئِكَ يُبَدِّلُ ٱللَّهُ سَيِّـَٔاتِهِمۡ حَسَنَٰتٖ"

(الفرقان: 70)

واللہ تعالیٰ اعلم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ — سلام کی حقیقت

السلام علیکم: تم پر اللہ کی طرف سے ہر آفت سے سلامتی ہو۔

ورحمۃ اللہ: اور اللہ کی طرف سے تم پر رحمتیں ہوں۔

وبرکاتہ: اور یہ سلامتی اور رحمتیں ہمیشہ ہمیشہ تم پر قائم رہیں۔

یوں سلام محض ایک لفظ نہیں بلکہ ایک کامل اور جامع دعا

ہے جو مسلمان ایک دوسرے کے حق میں اللہ سے مانگتے ہیں۔

اس دعا کا اصل حاصل جنت ہے، کیونکہ جنت ہی وہ جگہ ہے

جہاں ہمیشہ کی سلامتی اور دائمی نعمتیں میسر ہوں گی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سلام کی فضیلت کی

خاطر بازار تشریف لے جایا کرتے تھے، حالانکہ وہاں ان کا

کوئی ذاتی کام نہ ہوتا۔ وہ صرف اس لیے جاتے کہ لوگوں کو

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہہ سکیں۔

مشکوٰۃ المصابیح – 4664

یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ سلام کرنا نہ صرف معاشرتی آداب ہے، بلکہ ایک عبادت بھی ہے—اور اس میں اخلاص اور اللہ کی رضا کا عنصر شامل ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

دعا اور عبادت

دعا عبادت کا مغز اور خلاصہ ہے، بلکہ ایک روایت کے مطابق

دعا ہی عبادت ہے۔

دعا مانگنے کے دو بنیادی طریقے ہیں:

1. اسمائے حسنیٰ کے ذریعے دعا:

اللہ تعالیٰ کے خوبصورت ناموں کو وسیلہ بنا کر دعا مانگنا،

مثلاً: یا اللہ، یا رحمن، یا رب محمد ﷺ۔ اس میں اللہ کی

حمد و ثنا بیان کرکے اپنی حاجت پیش کی جاتی ہے۔

اعراف 180

2. نیک عمل کو وسیلہ بنا کر دعا:

اپنے اعمالِ صالحہ جیسے ایمان، نماز، روزہ، درود شریف، خدمتِ خلق وغیرہ کو وسیلہ بنا کر دعا کرنا۔ مثال کے طور پر، ایمان کو وسیلہ بنا کر مغفرت یا جنت طلب کرنا۔

صحیح البخاری: حدیث نمبر 5974

صحیح مسلم: حدیث نمبر 2743

یہ دونوں طریقے اپنی ذاتی دعا کے لیے بھی ہیں اور دوسروں کے حق میں دعا کرنے کے لیے بھی۔ دوسرے کے لیے دعا کرتے وقت یا تو

اللہ کے ناموں کا وسیلہ پیش کریں، یا اس کے کسی نیک عمل

کا ذکر کریں۔

قرآن میں ارشاد ہے: "اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو"

(المائدہ: 35)۔

اس کا مطلب ہے کہ مختلف نیک اعمال کے ذریعے اللہ کا قرب

ڈھونڈو۔ مثلاً اگر صرف اسمائے حسنیٰ کے ذریعے دعا پوری نہ

ہو تو والدین کی خدمت کو وسیلہ بنا لو۔ اہلِ علم فرماتے ہیں

کہ معلوم نہیں کون سا عمل اللہ کے ہاں مقبول ہو جائے اور

مغفرت کا سبب بن جائے۔

اللہ تعالیٰ دعا سے راضی ہوتا ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ "جو اللہ کی

عبادت (یعنی دعا) سے منہ موڑے گا، اللہ اسے جہنم میں داخل

کرے گا" (غافر: 60)۔

حدیث میں ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی حاجت بھی اللہ سے مانگو،

یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی (مشکوٰۃ 2251)۔ مقصد یہ ہے

کہ بندہ اپنے دل میں یہ خیال نہ لائے کہ مجھے اس چیز میں

اللہ کی ضرورت نہیں۔

لہٰذا، ہر عبادت اور ہر نیک عمل کا اصل مقصد دعا ہونا چاہیے۔ عبادت اور دعا کی تعریفیں الگ الگ ہیں، لیکن حقیقت میں دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں۔

واللہ تعالیٰ أعلم

آدابِ قرآن

قرآن کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ انسان قرآن کی آیات کو سب سے پہلے اپنے اوپر فٹ کرے اور اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔

جب مدح (تعریف) والی آیت اپنے اوپر صادق آئے تو دل ہی دل میں الحمد للہ کہے اور اس خیر کو اللہ کی توفیق سے منسوب کرے۔

اور جب وعید یا زجر والی آیت اپنے اوپر فٹ ہو تو استغفر اللہ کہے، اللہ کی طرف رجوع کرے اور دعا کرے کہ اللہ اس بری صفت کو خیر و عافیت کے ساتھ دور فرما دے۔

مثال کے طور پر:

قرآن میں جہاں یہود، منافقین یا کفار کی خصلتوں کا ذکر ہے،

تو ان آیات کو دوسروں پر تھوپنے کے بجائے سب سے پہلے اپنے

آپ پر پرکھیں۔

(البتہ عملی زندگی میں فیصلہ کرنے کے لیے دوسروں پر تطبیق

کی جا سکتی ہے، جیسے دوستی، کاروبار یا رشتہ داری کے

معاملات میں۔)

ابن ابی ملیکہ نے کہا کہ میں نبی اکرم ﷺ کے تیس صحابہ

سے ملا ، ان میں سے ہر ایک کو اپنے اوپر نفاق کا ڈر لگا ہوا تھا ،

ان میں کوئی یوں نہیں کہتا تھا کہ میرا ایمان جبریل و

میکائیل کے ایمان جیسا ہے اور حسن بصری سے منقول ہے ،

نفاق سے وہی ڈرتا ہے جو ایماندار ہوتا ہے اور اس سے نڈر وہی

ہوتا ہے جو منافق ہے ۔

صحیح البخاری 48

واللہ تعالیٰ أعلم

عبادت کی اقسام

عبادت بنیادی طور پر دو قسم کی ہے:

1) قولی عبادت

یہ زبان سے کی جانے والی عبادت ہے، جیسے ذکر و اذکار، تلاوتِ قرآن وغیرہ۔

2) فعلی عبادت

یہ عمل کے ذریعے کی جانے والی عبادت ہے، اور یہ مزید دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے:

ترکِ فعل: یعنی کسی چیز سے باز رہنا، جیسے روزہ رکھنا یا گناہوں سے پرہیز کرنا۔

اطاعت بالفعل: یعنی کسی عمل کو بجا لانا، اور یہ بھی دو طرح کی ہے:

بدنی عبادت: جو جسم کے ذریعے کی جاتی ہے، جیسے نماز۔

مالی عبادت: جو مال کے ذریعے کی جاتی ہے، جیسے زکوٰۃ۔

بعض عبادات میں بدن اور مال دونوں شامل ہوتے ہیں، جیسے حج۔

آخر میں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ تمام قولی اور فعلی عبادات دراصل "لا إله إلا الله" کے اظہار اور عملی شہادت کے لیے ہیں۔

واللہ تعالیٰ أعلم

احسان اور عبادت

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا کہ تم اُسے دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو یوں عبادت کرو گویا کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

(صحیح البخاری 50، صحیح مسلم 9 — متفق علیہ)

یہی دراصل عبادت میں احسان ہے۔

مقصد یہ ہے کہ بندہ اپنی عبادت کو ایسے ادا کرے جیسے وہ اللہ کو دیکھ رہا ہو۔ اگر یہ درجہ نہ پا سکے تو کم از کم یہ یقین رکھے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ دل و دماغ کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرے کہ:

اللہ غفور ہے، اگر عبادت میں کوتاہی ہوئی تو معاف فرما دے

گا۔

اللہ شکور ہے، وہ نیکی کی بے حد قدر کرتا ہے اور کسی بھی

مخلص عمل کو ضائع نہیں کرتا۔

جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے (مفہوم):

"اللہ محسنین کے اعمال کو ضائع نہیں کرتا۔"

پس جو شخص اس درجے کے ساتھ عبادت کرتا ہے وہ محسن

کہلاتا ہے، اور اسی کیفیت کی عبادت کو احسان کہا جاتا ہے۔

مفہوم یہ ہوا کہ اللہ غفور و شکور کی نظر سے دیکھ رہا ہے ۔

واللہ تعالیٰ أعلم

عبادت کا مسئلہ اور تقدیر کا ایک استعمال

اللہ کی عبادت کرنے کے بعد اپنے عمل پر گھمنڈ نہ کریں بلکہ

نظر اللہ کی طرف رکھیں کہ اگر وہ قبول فرمالے تو ہی اصل

کامیابی ہے۔

خانہ کعبہ کی تعمیر ایک عظیم عمل تھا، لیکن حضرت

ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اس پر اکتفا

نہیں کیا۔ بلکہ عاجزی کے ساتھ دعا کی:

"رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ"

کہ اے ہمارے رب! ہم سے قبول فرما، بے شک تو ہی سننے والا

اور جاننے والا ہے۔

البقرہ – 127

یہی سچا رویہ ہے کہ بندہ اپنی محنت کو اللہ کی بارگاہ میں
پیش کرے اور بھروسہ اپنی عبادت یا عمل پر نہیں بلکہ اللہ
کی قبولیت پر رکھے۔ پھر جب خیر مل جائے تو "الحمد للہ"
کہہ کر اسے اللہ ہی کی طرف منسوب کرے۔

قرآن میں قارون کا قول نقل ہوا ہے کہ:

"إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي"

(القصص: 78)

یعنی یہ سب مجھے میرے اپنے علم و قابلیت کی وجہ سے ملا

ہے۔

یہ گھمنڈ کا طریقہ ہے۔

اس کے برعکس حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

"فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ"

)یوسف: 90(

یعنی اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

یہ شکر اور توکل کا طریقہ ہے۔

پس اصل کامیابی یہ ہے کہ عمل اللہ کے لئے کیا جائے، قبولیت

اللہ سے مانگی جائے، اور ہر خیر اللہ کی طرف منسوب کی

جائے۔

واللہ تعالیٰ أعلم

لازوال غلبہ اور شہرت

الٓرۚ كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ

رَبِّهِمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (ابراہیم: 1)

ترجمہ:

یہ (پرنور) کتاب ہم نے تم پر اس لیے نازل کی ہے کہ تم لوگوں

کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آؤ، ان کے رب کے

حکم سے، غالب اور سزاوارِ حمد کے راستے کی طرف۔

انسان کی فطرت دو چیزوں کی طرف مائل ہے:

غلبہ اور شہرت۔

اسی خواہش کے پیچھے وہ مال و دولت اور دنیاوی اسباب کے لئے

دوڑتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں حاصل ہونے والا

غلبہ اور شہرت فانی ہے، جبکہ انسان کی اصل فطرت لازوال

غلبہ اور دائمی شہرت چاہتی ہے۔ اور وہ صرف اللہ کے بتائے

ہوئے راستے، یعنی "عزیز و حمید" کے قوانین کو اختیار کرنے

سے حاصل ہوسکتی ہے۔

انسان کہتا ہے: میں جلدباز ہوں، مجھے غلبہ اور شہرت فوراً

چاہیے، وہ بھی تیرے قوانین اور تقدیر کے نظام کے بغیر۔

اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے: اگر ایسا چاہتے ہو تو اس کائنات میں

کوئی جگہ تلاش کرو جہاں میرا اختیار نہ ہو، پھر وہاں جا کر

اپنی دائمی بادشاہت قائم کرو۔ لیکن جب تم ایسی جگہ نہ پاؤ

تو میری آیات اور قوانین کے سامنے جھک جاؤ۔

فرعون نے یہی کیا۔ اس نے اللہ کے قوانین کے بغیر غلبہ اور شہرت چاہی۔ اللہ نے اسے بطورِ آزمائش وقتی غلبہ دیا، لیکن وہ غلبہ فانی ثابت ہوا۔ قرآن بتاتا ہے کہ فرعون کی ہلاکت کا اصل سبب یہی تھا کہ اس نے اللہ کی آیات اور قوانین کا انکار کیا۔ گویا وہ کہتا تھا: میں اللہ اور اس کے قوانین کے بغیر بھی اپنی بادشاہت قائم کرسکتا ہوں۔ یہی سوچ ظلمت اور تاریکی ہے۔

اصل روشنی یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی توفیق سے "عزیز و حمید" کے راستے کو اختیار کرے۔ اللہ کی توفیق کے بغیر کوئی راستہ آسان نہیں ہوتا۔ اللہ کے قوانین کو محض بوجھ سمجھنا

اسی لئے مشکل لگتا ہے کہ انسان ان میں اللہ کی توفیق کو دیکھ

نہیں پاتا۔

"بِإِذۡنِ رَبِّهِمۡ"

یعنی: رب کے حکم اور اس کی توفیق کے ساتھ۔

اسی لئے دعوت اور تبلیغ کا طریقہ بھی اللہ کے حکم کے مطابق

ہونا چاہیے: نرم لہجے میں، تہذیب یافتہ انداز میں، موقع اور

محل کے مطابق، قرآن و سنت کی روشنی میں۔ نہ یہ کہ اللہ

کے اصولوں کو چھوڑ کر اپنی من مانی تدبیریں ایجاد کی

جائیں۔

پس لازوال غلبہ اور شہرت صرف اسی کے لئے ہے جو اپنے رب کے قوانین اور توفیق کے ساتھ جڑا رہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم

ضد و عناد

تعریف:

حق واضح ہو جانے کے باوجود محض دشمنی، حسد یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے اسے تسلیم نہ کرنا ضد و عناد کہلاتا ہے۔ یہ رویہ انسان کو کفر تک لے جاتا ہے۔

ضد و عناد کی وجوہات

1. تکبّر

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ"

)صحیح مسلم، کتاب الإیمان، حدیث 91(

ترجمہ: "تکبّر حق کو ٹھکرانا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔"

سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ جسے انسان حقیر سمجھتا ہو، اس کی بات قبول کرنے میں عار محسوس کرتا ہے۔ یہی شیطان نے کیا:

﴿أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ (البقرة: 34)

"اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں شامل ہو گیا۔"

2. حسد

شیطان نے آدمؑ سے حسد و تکبر کیا اور انکار کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا يَجْتَمِعَانِ فِي قَلْبِ عَبْدٍ الْإِيمَانُ وَالْحَسَدُ

کسی مومن کے دل میں ایمان اور حسد جمع نہیں ہو سکتے ۔

سنن نسائی – 3111

3. تعصب

مسلک، پارٹی یا گروہ بندی کی بنا پر حق کی مخالفت کرنا بھی عناد ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ﴾ (المائدة: 70)

"جب بھی کوئی رسول ان کی خواہش کے خلاف آیا، ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک کو قتل کردیا۔"

4. شخصیت پرستی

کسی پسندیدہ شخصیت یا عالم کے قول کے خلاف بات ہو تو

قبول نہ کرنا۔ قرآن نے فرمایا:

﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ﴾ (التوبة: 31)

"انہوں نے اپنے علما اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب (حاکم) بنا

لیا۔"

5. آبا و اجداد کی اندھی پیروی

سب سے خطرناک سبب یہی ہے۔

﴿إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ﴾

(الزخرف: 23)

"ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا اور ہم انھی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔"

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کا اتباع کرو، جو اللہ نے نازل فرمایا تو کہتے ہیں کہ بلکہ ہم اس کا اتباع کریں گے

جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا۔ کیا وہ اپنے باپ دادوں

کا اتباع کریں گے اگرچہ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور

ہدایت پر نہ ہوں۔"

البقرہ – 170

ذاتی تحقیق: کفر کی دو قسمیں

1. کفر سببی (عنادی کفر)

یہ وہ کفر ہے جو ضد و عناد کی وجہ سے ہو۔

مثال: کسی نے اللہ کے وجود کو ہٹ دھرمی سے جھٹلایا، پھر قرآن کا انکار جہالت کی بنا پر کیا۔ اس پر پہلے ہی اللہ کی حجت قائم ہو چکی تھی۔ اگر وہ بغیر توبہ مر گیا تو کافر اور جہنمی ہے۔

﴿وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا﴾ (النمل: 14)

"انہوں نے انکار کیا، حالانکہ دل یقین کر چکے تھے، ظلم اور تکبر کی بنا پر۔"

رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ

الرُّسُلِ

)النساء 4:165(

ترجمہ:

ان سب رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ڈر سنانے والے بنا کر

بھیجا، تاکہ نہ رہے لوگوں کے لئے کوئی (عذر) حجت اللہ کے

حضور ان رسولوں کے (آنے کے) بعد۔

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ

(الأنفال 8:42)

ترجمہ:

تاکہ جس نے ہلاک ہونا ہے وہ واضح دلیل کے بعد ہلاک ہو اور جس نے زندہ رہنا ہے وہ بھی واضح دلیل کے بعد زندہ رہے۔

2. کفرغیر سببی (جہالت مطلق)

یہ وہ کفرہے جس میں عناد شامل نہ ہو۔

مثال: کوئی شخص اللہ کے وجود کو جہالتِ مطلق سے نہ مانے،

لیکن اس نے کبھی ضد و عناد سے انکار نہ کیا ہو۔ ایسے پر ابھی

حجت قائم نہیں ہوئی۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ (الإسراء: 15)

"ہم کسی کو عذاب دینے والے نہیں جب تک رسول نہ بھیج

دیں۔"

اسی طرح:

﴿وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَن يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنزِلَ

إِلَيْهِمْ خَاشِعِينَ لِلَّهِ﴾ (آل عمران: 199)

"اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس پر بھی جو تم پر نازل ہوا اور اس پر بھی جو ان پر نازل ہوا۔"

اور حدیث:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"والذي نفس محمد بيده، لا يسمع بي أحد من هذه الأمة يهودي ولا نصراني، ثم يموت ولم يؤمن بالذي أرسلت به، إلا كان من أصحاب النار"

(صحيح مسلم 153)

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ! اس امت

(امت دعوت) کا کوئی ایک بھی فرد ، یہودی ہو یا عیسائی ،

میرے متعلق سن لے ، پھر وہ مر جائے اور اس دین پر ایمان نہ

لائے جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا تو وہ اہل جہنم ہی سے ہو

گا۔"

→ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حجت پہنچنے کے بعد انکار کفرِ

سببی ہے، اور حجت نہ پہنچنے پر معذوری ممکن ہے۔

نتیجہ

ضد و عناد باطنی مرض ہے۔ ہر شخص اپنے دل سے جانتا ہے کہ وہ
حق کو ضد کی وجہ سے جھٹلا رہا ہے یا واقعی جہالت میں ہے۔

ایمان ایک یقینی چیز ہے، اسے صرف یقینی ضد و عناد توڑ
سکتا ہے، محض شک یا وسوسہ نہیں۔

لہٰذا اپنے ایمان پر مطمئن رہیں، مگر انجام کے بارے میں
فکرمند رہیں کہ ضد و عناد کا کوئی شائبہ ایمان کو برباد نہ
کردے۔

والله تعالیٰ أعلم

مذہب کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

< وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ

(البقرة 2:78)

یعنی: "ان میں سے بعض جاہل ہیں جو کتاب کو نہیں جانتے
مگر صرف آرزوئیں (خواہشات) اور گمان رکھتے ہیں۔"

یہی حال آج بہت سے مسلمانوں کا ہے، جو دین کو سمجھے بغیر
محض دعووں اور ناموں پر اکتفا کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر، اللہ تعالیٰ نیکی کے بدلے میں نعمت عطا کرتا
ہے۔ اگر کوئی شخص کہیں بغیر سوچے سمجھے والدین کی

خدمت کر بیٹھے (جو کہ نیکی ہے)، تو اللہ اس نیکی کے صلے میں اس کے کاروبار میں برکت ڈال دیتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ کتاب اللہ کو سمجھتا نہیں، اس لئے اس نعمت کو غلط جگہ منسوب کرتا ہے اور کہتا ہے: "میں فلاں بابا کی قبر پر گیا، وہاں سے مدد مانگی، اسی نے میرے کاروبار میں برکت ڈال دی۔"

اسی طرح جب کوئی شخص بہنوں کا حق مار کر ان کی جائیداد ہڑپ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے رجوع کی طرف لانے کے لئے کسی تکلیف میں مبتلا کرتا ہے۔ لیکن وہ حقیقت کو نظر انداز کر کے یہ کہتا ہے: "مجھے نظر لگ گئی ہے۔"

(حالانکہ نظر لگنا حق ہے، مگر ہر تکلیف کی وجہ نظر بد نہیں ہوتی۔)

مذہب دعویٰ نہیں بلکہ ذمہ داری ہے

مذہب صرف اپنے آپ کو کسی قوم، مسلک یا جماعت کے ساتھ جوڑنے کا نام نہیں بلکہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا نام ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

ترجمہ:

بیشک (اللہ کے قانون عدل و انصاف کے مطابق) جو لوگ

ایمان لائے، جو یہودی بن گئے، اور نصرانی اور صابی (ان میں

سے) جو کوئی بھی (سچے دل سے) ایمان لایا اللہ پر اور روز آخر

پر، تو ایسوں کیلئے (بلا فرق وتمیز) ان کا اجرہے ان کے رب کے

یہاں، اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں

گے

البقرہ 62

یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اندھی تقلید یا محض نام کا سہارا

ایمان نہیں ہے۔

یہود و نصاریٰ کی خصلتوں سے عبرت

قرآن نے یہود و نصاریٰ کی کئی خصلتیں بیان کی ہیں تاکہ

مومنین ان سے بچیں۔ مثلاً:

1. گناہ کو معمولی سمجھنا اور کہہ دینا کہ چند دن کے بعد

جہنم سے نکل جائیں گے

> وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً

(البقرة 2:80)

2. شفاعت پر غلط بھروسہ کر کے گناہ کرنا

نبی ﷺ نے فرمایا:

" >یا فاطمة بنت محمد! سليني من مالي ما شئت، لا أغني عنكِ من الله شيئًا"

)صحیح البخاری: 2753، صحیح مسلم: 204(

یعنی: "اے فاطمہ! محمد کی بیٹی، مجھ سے میرے مال میں سے جو چاہو مانگ لو، اللہ کے سامنے میں تمہارے کچھ کام نہیں آؤں گا۔"

یہ واضح دلیل ہے کہ محض نسبت کافی نہیں، بلکہ عمل

ضروری ہے۔

3. بخل

نبی ﷺ نے فرمایا:

" <مَن مَلَكَ زَادًا ورَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ إلى بَيْتِ اللَّهِ ولَمْ يَحُجَّ، فَلَا عَلَيْهِ أنْ يَمُوتَ يَهُودِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا"

)سنن دارمی: 1772، مستدرک حاکم: 1737 — صحیح کہا(

یعنی: "جس کے پاس حج کی استطاعت ہو اور پھر بھی حج نہ کرے تو اس پر کوئی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی یا نصرانی کی موت مرے۔"

یہ حدیث بتاتی ہے کہ بخل اور فرض کو چھوڑ دینا مذہب سے

محرومی ہو سکتی ہے ۔

ایمان خصلت سے پہچانا جاتا ہے

قرآن میں ہے:

> وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُمْ

مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ

(آل عمران 3:75)

یعنی: "اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو بڑی امانت بھی

ادا کر دیتے ہیں، اور کچھ ایسے ہیں جو ایک دینار بھی واپس

نہیں کرتے۔"

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ قوموں کو دعوے کے بجائے

خصلتوں سے پہچانتا ہے۔

اسی لئے حدیث میں آیا ہے:

" حلا يَزَالُ العَبْدُ في صِدْقٍ حتى يُكْتَبَ عِندَ اللَّهِ صِدِّيقًا، ولا يَزَالُ يَكْذِبُ حتى يُكْتَبَ عِندَ اللَّهِ كَذَّابًا"

)صحیح البخاری: 6094، صحیح مسلم: 2607(

یعنی: "آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے، اور جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔"

نتیجہ

مذہب نام یا دعویٰ نہیں، بلکہ ذمہ داری ہے۔

قرآن و حدیث نے یہودیت، نصرانیت اور کفر کی خصلتیں

بیان کرکے ہمیں خبردار کیا ہے۔

مومن اپنی زندگی کا جائزہ لے کہ آیا وہ ایمان کی خصلت پر ہے یا

یہود و نصاریٰ کی خصلت پر۔

< إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ. لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ

(التکویر 27–28)

یعنی: "یہ قرآن تو تمام جہان والوں کے لئے نصیحت ہے۔ اس کے لئے جو چاہے سیدھے راستے پر چلنا۔"

اللہ کے حکم میں شیطان دو طریقوں سے انسان کے عمل میں
مداخلت کرتا ہے، اور اسے کوئی پرواہ نہیں کہ وہ کون سے
راستہ پر کامیاب ہو جائے: ایک کمی کی طرف اور دوسرا بیشی
کی طرف۔ اسلام ہمیں ہمیشہ میانہ روی اختیار کرنے کی
ہدایت دیتا ہے تاکہ نہ زیادہ سختی اور نہ ہی غفلت دین میں
نقصان کا سبب بنے۔

یہ حقیقت زندگی کے عملی پہلوؤں میں واضح ہوتی ہے: کچھ
لوگ حق کے برعکس ظلم کرتے ہیں، اور کچھ لوگ حق کے
نام پر بھی غیر معتدل رویہ اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً، اگر کوئی
شخص اپنی زندگی صرف تبلیغ میں گزار دے اور بیوی بچوں یا

والدین کی خدمت کو ترک کرے، تو یہ اسلام کے مطابق اعتدال کا راستہ نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ علم و تبلیغ کے ساتھ ساتھ حلال مال کمایا جائے، والدین اور اہل خانہ کی خدمت کی جائے، اور دینی ذمہ داریوں کو اعتدال کے ساتھ پورا کیا جائے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

اللّٰہ نیکی کے بدلے نعمتیں عطا کرتا ہے

اسباب کے دائرے میں مخلوق سے حاجت طلب کرتے وقت یہ نظریہ لازمی ہے کہ اللّٰہ کی مشیت شامل ہو تو ہی مخلوق مدد کر سکتی ہے۔ ورنہ یہ عمل "یَدۡعُوۡنَ مِن دُونِ اللّٰہ" کے زمرے میں آتا ہے، جسے کفر و شرک کہا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں اللّٰہ کی مشیت کو کمزور سمجھا گیا ہے، حالانکہ اللّٰہ کی مشیت کے بغیر کوئی مخلوق خود کچھ نہیں چاہ سکتی۔

مثال کے طور پر، دلیل بدیہی سے ثابت ہے کہ پانی کے ذریعے اللّٰہ جب چاہے پیاس بجھاتا ہے۔ اس لئے پانی سے مدد طلب کی جا

سکتی ہے، لیکن اس نظریے کے ساتھ کہ یہ پانی کا خالق اللہ ہے

اور اللہ ہی جب چاہے پیاس بجھاتا ہے۔ (قرآن میں مفہوم: "یہ

دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سوا کچھ نہیں"۔) یہ نظریہ آسان

اور معمولی لگ سکتا ہے، لیکن اس کی عملی مشق انسان کے دل

و دماغ میں انقلاب پیدا کرتی ہے۔ قرآن نے بھی اس بات پر

زور دیا کہ شرک سے پاک زندگی گزارو، یعنی نظریں ہمیشہ

اللہ کی طرف ہوں۔

عالم برزخ میں رہنے والے بزرگ سے مدد طلب کرنا نہ تو دلیل

بدیہی سے ثابت ہے، نہ قرآن نے اس کا اثبات کیا ہے۔ بلکہ

قرآن نے یہ نفی کیا ہے کہ وہ کسی طرح مدد نہیں کر سکتے۔

اس لئے ان سے مدد طلب کرنا ، اگرچہ نیت شرک سے پاک ہو،

کفر کے خطرے کے ساتھ جڑا ہو سکتا ہے۔

)مفہوم احقاف 5(

ہمیں ہر چیز میں اللّٰہ ہی پر اعتماد کرنا چاہیے۔ اللّٰہ کن کے

ذریعے بھی بغیر محنت و صبر کے ضروریات فراہم کر سکتا ہے،

لیکن تقدیر کے مطابق بظاھر نیکی کے بدلے یہ فراہم کی جاتی

ہیں لیکن نیکی بھی للہ کی توفیق سے ہے۔ مثال کے طور پر، اگر

کسی کی رزق اللّٰہ نے کسی دوکان میں رکھی ہے، تو رزق طلب

کرنے کے لئے دوکانداری کو کہ خدمت و نیکی ہے، کو وسیلہ بنانا

پڑتا ہے۔ نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری رزق اللّٰہ نے تلوار کی نوک میں رکھی ہے۔

اسی طرح، جب کوئی انسان مجبوروں پر صدقہ کرتا ہے، تو چونکہ یہ نیکی ہے، اللّٰہ اس نیکی کے بدلے اس کو رزق عطا کرتا ہے۔ اگر بندہ کہے کہ میں تنگ آ چکا ہوں اور مزید نہیں کر سکتا، تو بھی اللہ فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ رزق کہیں اور فراہم کرو، اور انسان صرف خود کو نیکی اور بھلائی سے محروم کرتا ہے۔

حرام کمائی میں بھی اللّٰہ رزق عطا کرتا ہے، لیکن یہ رزق حرام

عمل کے بدلے نہیں بلکہ ماضی کی نیکیوں کے بدلے دیا جاتا ہے۔

حرام عمل اکثر جلد بازی اور بے صبری کا نتیجہ ہوتا ہے، اس

لئے اللہ بطور امتحان نیکی کا بدلہ اس دنیا میں دے دیتا ہے،

جبکہ گناہ الگ سے لکھا جاتا ہے۔

نیکی کا بدلہ اگرچہ آخرت میں بھی دیا جائے گا، لیکن بعض

اوقات دنیا میں "بونس" کے طور پر بھی ملتا ہے۔ اس لیے

اخلاص اور نیک اعمال کی ترغیب دی گئی ہے۔ جب انسان کو

یہ معلوم ہو جائے کہ نیکی کے بدلے نعمتیں ملتی ہیں، تو وہ

مزید نیک اعمال میں لگ جاتا ہے۔

واضح رہے کہ نیکی بذات خود خدا نہیں ہے، بلکہ اللّٰہ سے مدد طلب کرنے کا ذریعہ ہے، اس لئے نظریں ہمیشہ اللّٰہ کی طرف ہونی چاہیے۔

عملی مثالیں

عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بادشاہ ملنے آ رہا تھا۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ شاہانہ لباس پہنیں۔ انہوں نے پہنا ، لیکن بعد میں کہا کہ میں اپنی نیکیاں اس دنیا میں ختم نہیں کرنا چاہتا۔

ایک مالدار صحابی نے دسترخوان پر نظر دوڑائی اور فکر مند ہو گئے کہ اللہ میری نیکیوں کا بدلہ اس دنیا میں ختم تو نہیں کر رہا۔

نبی کریمؐ صلی اللہ علیہ وسلم آدھا کجھور خود کھاتے اور آدھا

خیرات کرتے، تاکہ جو نیکی کھانے میں ختم ہوئی وہ خیرات

سے واپس مل جائے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

مغفرت اور رحمت والی آیات و احادیث کا مقصد

اگر کوئی یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں اور غفلت میں پڑے رہنے کی ترغیب دیتا ہے، تو یہ اس کی عقل میں نقص کا مظہر ہے۔ یہ کیسی بات ہے کہ قرآن میں غفلت اور گناہ کرنے کی مذمت بھی ہے اور ساتھ میں ان میں رہنے کی ترغیب بھی دی گئی ہو؟

اصل مقصد یہ ہے کہ انسان نیکی اور توبہ کی طرف مائل ہو، یعنی جو گناہ کیے گئے، ان کو نیکی کے ذریعے مٹانے کی کوشش کی جائے۔

انسان جب دن بھر گناہ کرتا ہے اور پھر نیکی کی طرف رجوع کرتا ہے، تو شیطان یا نفس اسے طعنے دے سکتا ہے کہ اب نیکی کا کیا فائدہ؟ لوگ بھی کہتے ہیں، "سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔" اس وجہ سے انسان مایوس ہو کر نیکی ترک کر سکتا ہے، لیکن اسی وقت مغفرت اور رحمت والی آیات کی صدا آتی ہے کہ تمہاری نیکی اللّٰہ کے دربار میں قدر رکھتی ہے، چاہے تم آئندہ بھی گناہ کا ارادہ رکھتے ہو۔

حدیث میں بھی یہ پیغام موجود ہے کہ طوائف کو کتے کو پانی پلانے پر بخش دیا گیا۔ دنیا خاص طور پر عرب معاشرے میں

طوائف کو حقیر سمجھتی تھی، لیکن اللّٰہ کے نزدیک ہر کسی

کی نیکی کی قدر ہے۔ لہٰذا مایوس نہ ہو، نیکی جاری رکھو اور

کسی بھی نیکی کو حقیر نہ سمجھو۔

اللّٰہ کی رحمت سے جنت کا وعدہ ہے، اور اس کا مقصد یہ بھی ہے

کہ عبادت میں اعتدال اختیار کیا جائے۔ تکلف کے درجے تک

عبادت کو نہ پہنچایا جائے، مثلاً ساری رات تہجد پڑھ کر دن

کے فرائض ادا کرنے سے قاصر نہ ہوا جائے۔

مزید برآں، نیکی اور گناہوں کو مٹانے کی کوشش بھی اللّٰہ کی

رحمت سے ممکن ہے۔ نیکی کرتے وقت خود کو کریڈٹ نہ دو

بلکہ "الحمد للّٰہ" پڑھ کر اللّٰہ کی طرف منسوب کرو۔ عبادات میں صبر اور استقامت بھی اللّٰہ کی رحمت کا حصہ ہے۔

یہ سمجھنا کہ گناہ کرکے بے فکر رہو، عقل میں نقصان کا تقاضا ہے۔ اللّٰہ کی طرف سے صدا آتی ہے کہ تم فرشتہ نہیں بن سکتے، لہٰذا یہ امید رکھنا کہ آخری عمر میں توبہ کرکے فرشتہ بن جاؤں گا اور نیکیاں کرتا رہوں گا، غیر فطری ہے۔ ہر دور میں انسان گناہ کرے گا، لہٰذا فطری زندگی یہ ہے کہ صبح کے گناہ شام تک مٹانے کی کوشش کریں اور شام کے گناہ صبح تک۔ ایسے افراد کو "توابین" کہا جاتا ہے اور ان کے لئے مغفرت اور رحمت کا وعدہ ہے۔

گناہ کرتے وقت یہ بھی حساب کیا جائے کہ اس کا ازالہ کیسا ہوگا، مثلاً دل آزاری یا بددعائیں لینے والے گناہوں سے پرہیز کیا جائے، کیونکہ ان کا ازالہ مشکل ہے۔

اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ اللّٰہ نے انسان سے معصوم بننے کا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ مغفور بننے کا موقع دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :" اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ

میں میری جان ہے ! اگر تم (لوگ) گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ

تم کو (اس دنیا سے) لے جائے اور (تمہارے بدلے میں) ایسی

قوم کو لے آئے جو گناہ کریں اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگیں

تو وہ ان کی مغفرت فرمائے ۔"

صحیح مسلم 2749

اس طرز زندگی میں انسان ہر وقت اللّٰہ کو اکیلا حاکم مان

سکتا ہے، حتیٰ کہ گناہ کرتے وقت بھی۔

واللہ تعالیٰ اعلم

تین نظریات جو انسان کو عمل میں کمزور بنا دیتے ہیں

انسانی زندگی میں تین نظریات ایسے ہیں جو عمل میں سستی اور کمزوری پیدا کرتے ہیں:

1. قیامت سے انکار

2. یہودیت: یہ تصور کہ چند دن جہنم میں رہنے کے بعد، آخر کار جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

3. نصرانیت: یہ خیال کہ عیسیٰ علیہ السلام، محمد صلی اللہ علیہ وسلم، یا علی رضی اللہ عنہ وغیرہ ہمیں بخش دیں گے، اور چونکہ وہ اللہ کے محبوب ہیں، اس لیے ہم بھی اللہ کے محبوب ہوئے، لہٰذا اللہ ہمیں کچھ نہیں کہے گا اور ہم آزاد ہیں۔

ان نظریات کے زیر اثر انسان آسمانی کتابوں کو نہ دل سے سنتا ہے، نہ آنکھ سے دیکھتا ہے، اور نہ ان کی آیات پر غور و فکر کرتا ہے۔ نتیجتاً، اس کی علمی اور عملی حالت کمزور اور بھٹکی ہوئی ہو جاتی ہے۔

قرآن میں اس کا ذکر ہے:

> أُولَٰٓئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۞ 7:179

ترجمہ: یہ لوگ (بالکل) جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور

> إِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۞

8:22

ترجمہ: کچھ شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تمام جانداروں سے بدتر بہرے گونگے ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے۔

قرآن کے نزول کا مقصد

قرآن مجید کا نزول اس لیے ہوا ہے تاکہ اس کی آیات میں تدبر کیا جائے اور نصیحت حاصل کی جائے:

> كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوۡۤا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝

38:29

ترجمہ: یہ کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے بابرکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور اہل عقل نصیحت پکڑیں۔

غور و فکر کے لیے معنی کی سمجھ ضروری ہے، اور اگر کوئی قرآن کی آیات نہیں سمجھتا تو اہل علم سے دل کے کانوں سے سننا چاہیے:

< اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَہُوَ شَہِیۡدٌ

۝ 50:37

ترجمہ: بے شک اس کتاب میں نصیحت ہے اس کے لیے جو دل (آگاہ) رکھتا ہے یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔

خلاصہ

ان نظریات کے زیر اثر انسان قرآن اور اللہ کی ہدایت سے دور رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم سب گمراہ ہو، مجھ سے ہدایت طلب کرو، میں تمہیں ہدایت دوں گا۔

لہٰذا عملی زندگی میں فطری کمزوری، غفلت اور غیر توجہی سے بچنے کے لیے ایمان، تدبر، اور توبہ کے راستے پر عمل ضروری ہے۔

والله تعالیٰ اعلم

سوالات اور نبی کریم ﷺ کے جوابات کا طریقہ

عموماً سوالات چار طرح کے ہوتے ہیں:

1. سوال جو حکمت و دانائی پر مشتمل ہو۔

2. سوال جس میں جہالت پائی جاتی ہو۔

3. سوال جو ریپیٹڈ (repeated) ہو۔

4. کثرتِ سوال (بار بار غیر ضروری سوالات)۔

نبی ﷺ کے جوابات کے اصول:

1. ظاہری سوال کا جواب:

نبی ﷺ عام طور پر سوال کا وہ جواب دیتے جو سوال کے ظاہری مطلب کے مطابق ہوتا۔

2. جہالت کا ازالہ:

اگر سوال کرنے والے میں جہالت پائی جاتی، تو نبی ﷺ اس جہالت کا ازالہ کرتے اور سوال کے ظاہری جواب کی طرف نہیں جاتے۔

مثال کے طور پر، ایک شخص نے پانچ غیبی سوالات پوچھے۔

اللہ تعالیٰ ان کا جواب وحی کے ذریعے دے سکتے تھے، لیکن سائل

یہ سمجھتے تھے کہ نبی ﷺ عالمِ الغیب ہیں۔ نبی ﷺ نے

انہیں بتایا کہ غیب تک بغیر اسباب کے پہنچنا مخلوق کے

بس کی بات نہیں۔

3. ریپیٹڈ سوالات:

اگر ایک مسئلہ دوبارہ پوچھا گیا، تو نبی ﷺ سوال کے

ظاہری جواب کی بجائے تاویل شدہ مطلب کے جواب دیتے۔

مثال کے طور پر، ایک صحابی نے جنگ میں مرنے والے بچے کے بارے میں سوال کیا: "یہ نہیں ہونا چاہیے۔"

نبی ﷺ نے جواب دیا کہ جنگ کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

یہ اس لیے تھا کہ پہلے بھی بار بار یہ بات بیان ہو چکی تھی کہ جنگ میں معصوموں کو نقصان نہ پہنچائے۔ اس لئے سوال کا اصل مطلب یہ تھا کہ احتیاط کے باوجود بھی نقصان پہنچتا ہے۔ نبی ﷺ نے اس سوال میں تاویل کرتے ہوئے صحابی کو یہ سمجھایا کہ معاشرتی اصلاح کے لیے بعض اوقات جنگ آخری چارہ ہوتی ہے۔

4. کثرت سوال:

غیر ضروری اور بار بار پوچھنے والے سوالات پر نبی ﷺ غصہ

ہوتے، کیونکہ اس سے دین مشکل ہو جاتا۔

مثال کے طور پر، موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے گائے ذبح کرنے

کا حکم دیا۔ انہوں نے سوال پہ سوال کیا اور دین کو اپنے لیے

مشکل بنا لیا۔

البقرہ 67–71

اسی طرح، حج کے بارے میں ایک صحابی نے بار بار سوال کیا

کہ کیا ہر سال فرض ہے؟ نبی ﷺ خاموش رہے اور پھر فرمایا

کہ اگر میں ہاں کہتا تو ہر سال فرض ہو جاتا۔

صحیح مسلم 1337

5. درود شریف کا سوال:

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا کہ کون سا درود پڑھیں؟ نبی ﷺ نے فرمایا: درود ابراہیمی۔

میری تحقیق کے مطابق، اگر یہ سوال نہ کیا جاتا تو ہر وہ درود شریف، جس میں شرکیہ الفاظ نہ ہوں، اتنی فضیلت حاصل نہیں کر پاتا جتنی درود ابراہیمی میں ہے۔

یہ اصول اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ سوالات کے جواب میں حکمت، تعلیم، اور جہالت کے ازالے کو مدنظر رکھتے تھے، اور غیر ضروری بار بار سوالات سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

جہاد، محاربین، اور غیر محاربین کا فلسفہ

جہاد کو قرآن و سنت میں خیرخواہی اور اصلاح معاشرہ کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد خونریزی یا انتقام لینا نہیں بلکہ معاشرتی انصاف قائم کرنا اور دین اسلام کی سربلندی ہے۔

1. محاربین اور غیر محاربین

محاربین وہ افراد ہیں جو اپنے عزم اور قوت کے ذریعے اسلامی

معاشرے میں فساد پھیلاتے ہیں، اسلام کی آزادی اور تبلیغ کو

روکنے کی کوشش کرتے ہیں، اور معاشرے میں دین سے متنفر

کرنے والے حربے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہے:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (31:13)

ترجمہ: بیشک یقیناً شرک بہت ہی بڑا ظلم ہے۔

توحید اور اصلی اسلام انسان کو اللہ سے جوڑتے ہیں، کیونکہ

اللہ کے بغیر انسان یقیناً خسارے میں ہے۔ اصلی اسلام انسان

کو توابین بناتا ہے، اسے اپنے گناہوں کا حساب کرنے کی ترغیب

دیتاہے، کہ کس گناہ کا ازالہ کیسے کیا جائے۔ اس طرح انسان گناہوں میں حد کے مطابق عمل کرتاہے اور نیکیوں کے ذریعے گناہوں کو مٹانے کی کوشش کرتاہے۔ یوں اس انسان سے معاشرے میں جو گناہوں سے فساد پیدا ہوتاہے، اس کا ازالہ توبہ کے ذریعے ہو جاتاہے، اور انسان جہنم سے بچ کر جنت کی طرف بڑھتاہے۔

جبکہ کفر اور شرک انسان کو اللہ سے دور کر دیتے ہیں، اسے عمل میں کمزور بنا دیتے ہیں، اور اس کے گناہوں کو یا تو نیکیوں سے مٹاتے نہیں ہیں یا بدعت کے ذریعے مٹاتے ہیں، جو کہ اللہ کے نزدیک معاشرے کے لیے کوئی خیر نہیں لاتا۔

اس طرح انسان جنت سے محروم ہو کر جہنم کی طرف چلا جاتاہے، اور یہ ایک بہت بڑا ظلم ہے، کیونکہ کافر و مشرک نہ صرف اپنے ساتھ ظلم کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے ساتھ بھی جو ان کے کفر و شرک کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

اس کفر و شرک کے ذریعے معاشرے میں فساد پھیلانے کو روکنے کا واحد حل توحید اور اصلی اسلام کی تبلیغ ہے۔ جب اصلی اسلام معاشرے میں پھیل جائے تو کفر و شرک ختم ہو جائے گا، یعنی معاشرتی فساد کا ازالہ ہوگا۔

اگر اس صورتحال کو غیر مناسب انداز میں دیکھا جائے تو بعض لوگ سوچ سکتے ہیں کہ کافر یا مشرک کو قتل کیا جائے، انھیں زبردستی مسلمان بنایا جائے، ان کو آزادی سے اپنے مذہب پر جینے نہ دیا جائے، ان کی تبلیغ اور مذہبی اشاعت پر پابندی لگائی جائے، ان کے ساتھ تجارت بند کی جائے، یا اگر وہ پڑوس میں ہوں اور بھوکے ہوں تو ان کو کھلانے سے منع کیا جائے، تاکہ شرک و گناہ میں ان کی مدد نہ ہو۔ اس طرح لوگ جہنم سے بچ کر جنت میں جائیں۔

لیکن یہ طریقہ درست نہیں ہے، کیونکہ اس سے دنیا اسلام سے متنفر ہو جائے گی، لوگ اصلی اسلام کا مطالعہ نہیں کریں گے،

اور یوں اسلام کے پھیلاؤ میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ یہ اسلام کو
روکنے کے مترادف ہے، اور قرآن نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے
جو اللہ کے راستے میں رکاوٹ بننے والے ہیں۔

لہٰذا قرآن نے بطور عذر یہ قانون مقرر فرمایا:

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ ۙ (2:256)

ترجمہ: دین میں زبردستی نہیں ہے۔

غیر محاربین کے ساتھ حسن سلوک، احسان، اور تعاون کی

تعلیم قرآن میں موجود ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

ترجمہ:

اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا سلوک کرنے

سے نہیں روکتا جنہوں نے نہ تو دین کے معاملے میں تم سے

جنگ کی اور نہ ہی انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا

بلاشبہ اللہ پسند فرماتا (اور محبت کرتا) ہے انصاف کرنے

والوں سے

(الممتحنة 8)

یہ اصول واضح کرتا ہے کہ جہاد کا دائرہ صرف محاربین تک محدود ہے، اور غیر محاربین کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور حسن سلوک واجب ہیں تاکہ وہ اسلام کی طرف راغب ہوں۔

---

2. جہاد کا مقصد اور اصول

جہاد کا مقصد اسلام کی سربلندی اور پھیلاؤ ہے، نہ کہ ذاتی انتقام یا خونریزی۔ نبی ﷺ نے اپنی زندگی میں کئی مواقع پر یہ اصول اپنایا:

صلح حدیبیہ کے دوران عمر رضی اللہ عنہ نے ناراضگی ظاہر کی، تو نبی ﷺ نے فرمایا: "یہی فتح ہے"۔

مطلب: اسلام کو پھیلانے کی آزادی حاصل کرنا حقیقی فتح ہے، نہ کہ صرف دشمن کو ہر قیمت پر شکست دینا۔

فتح مکہ کے وقت نبی ﷺ نے مسجد حرام سے بتوں کو

ہٹایا، لیکن اس عمل کے پیچھے نیت یہ تھی کہ کفر و شرک

سے پاک جگہ ہو، نہ کہ ذاتی غصہ یا انتقام۔

یہ اصول اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ جہاد میں خونریزی

صرف ضرورت اور اصلاح معاشرہ کے تناظر میں جائز ہے، اور

اس میں کسی جذباتی انتقام کا عنصر نہیں ہونا چاہئے۔

---

3. محاربین کی پہچان

محاربین کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

1. وہ اسلام کی تبلیغ اور پھیلاؤ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

2. معاشرے میں فساد پھیلاتے ہیں۔

3. اپنے عزم اور لشکر کے ذریعے اصلی اسلام کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔

4. پروپیگنڈا، قومیت، یا مذہبی تعصب کے ذریعے لوگ ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔

غیر مسلموں میں اندازاً 10 افراد محاربین ہو سکتے ہیں،

جبکہ باقی 90 غیر محاربین یا پروپیگنڈہ کے ذریعے محاربین

کی حمایت میں شامل لوگ ہوتے ہیں۔

---

4. غیر محاربین کے ساتھ سلوک

غیر محاربین کو اسلام کی تعلیم سے دور کرنا درست نہیں۔

انہیں احترام، تعاون اور نرمی کے ساتھ رہنمائی کرنی چاہئے

تاکہ:

1. وہ اسلام کی طرف راغب ہوں۔

2. اسلام قبول کریں اور جہنم سے بچ کر جنت میں جائیں۔

3. کم از کم رکاوٹ نہ بنیں۔

محاربین کی چال

معاشرے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ضد و عناد کی وجہ

سے اصلی اسلام کو پھیلانے سے روکتے ہیں۔ ان کی مخالفت کی

اصل وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ کرپشن میں ملوث ہوتے ہیں اور ان

کی طاقت ان کے لشکر سے بڑھ جاتی ہے۔ چونکہ اصلی اسلام

انسان کو توابین بناتا ہے، یعنی انسان کو اپنے گناہوں کا حساب

کرنے اور انہیں درست کرنے کی تربیت دیتا ہے، اس لیے کرپٹ

لوگوں کے دل میں یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ اگر میرے لشکر اصلی اسلام قبول کر لیں گے اور توبہ کر جائیں گے تو میری طاقت کم ہو جائے گی۔ اس نیت سے یہ مخالفت شروع کر دیتے ہیں، تاکہ اپنی کرپشن جاری رکھ سکیں اور اس لئے اصلی اسلام کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اصلی اسلام ان کی عیاشی میں رکاوٹ ہے۔ ایسے لوگوں کو معاشرت میں "محاربین" کہا جاتا ہے۔ یہ افراد عموماً بہت کم ہوتے ہیں، اندازے کے مطابق تقریباً 2، یا آسان حساب کے لیے 10۔

محاربین اپنی مخالفت میں مختلف حربے استعمال کرتے ہیں، جن میں پروپیگنڈا، قومیت یا وطن پرستی، اور مذہب

پرستی شامل ہیں۔ جیسا کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے

خلاف یہ فارمولا اپنایا: اس نے یہ ظاہر کیا کہ موسیٰ تمہیں

بے وطن کرنا چاہتے ہیں، تم پر راج کرنا چاہتے ہیں، اور

تمہارے باپ دادا کے مذہب کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ

اصلی اسلام میں خلافت کا مقصد صرف خدمت خلق اور

معاشرتی اصلاح ہے۔ فرعون کی فکر یہ تھی کہ اگر لوگ اصلی

اسلام قبول کر لیں اور توابین بن جائیں تو اس کا لشکر تنہا

اور کمزور ہو جائے گا۔ اس لیے جادو گروں نے فرعون سے کہا

کہ تمہاری ہم سے دشمنی صرف ایمان کی وجہ سے ہے، اور

تمہیں اپنے حربے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔

جہاد ان محاربین کے خلاف ہے اور یہ ایک قسم کی دفاعی جنگ

ہے، جس کا مقصد اسلام کو پھیلانا اور لوگوں تک اصلی اسلام

پہنچانا ہے، تاکہ ہر معاملے میں اللہ کے قوانین نافذ ہوں، یعنی

ﷲ حاکم ہو اور مخلوق محکوم اور معاشرہ فساد سے محفوظ

رہے۔ محاربین لوگوں کو بڑے نقصان میں ڈال رہے ہیں، اس

لیے معاشرے کی اصلاح کے لیے ان کے خلاف کارروائی کی جاتی

ہے، جسے عقلی نفرت بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے

جیسے بدن کے کسی اعضاء میں خطرناک بیماری ہو اور ڈاکٹر

کہے کہ اس عضو کو کاٹنا ضروری ہے تاکہ پورے بدن کی اصلاح

ہو سکے۔ یہاں جذباتی نفرت کا کردار نہیں بلکہ محض عقلی

نفرت کی بنیاد پر کارروائی کی جاتی ہے۔

چونکہ یہ 10 محاربین بہت کم تعداد میں ہیں، انھیں مغلوب

کرنا مسلمانوں کے لیے ممکن اور آسان ہے۔ محاربین مختلف

حربے استعمال کر کے دنیا کو اسلام سے متنفر کرنے کی کوشش

کرتے ہیں، تاکہ لوگ ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور اس لئے

بعض منافق بن کر اسلام کے جامہ میں ناحق کام شروع کرتے

ہیں اور یوں ایک من گھڑت اسلام بھی وجود میں آ جائے۔ اس

عمل کے نتیجے میں 70 غیر محاربین وجود میں آ جاتے ہیں

جو من گھڑت اسلام کی مخالفت کرتے ہیں اور انھیں یہی لگتا

ہے کہ یہی اصلی اسلام ہے۔

یہی کام چودہ سو سال پہلے منافقین کرتے تھے، اور آج بھی کچھ

مولوی حضرات ممبر پر بیٹھ کر قرآن کی آیات کو غلط انداز

میں بیان کر کے، خیر خواہی کے بجائے نفرت انگیز انداز

اختیار کر کے، دنیا کو اسلام سے متنفر کرتے ہیں۔ مثال کے

طور پر، فتح مکہ کے موقع پر مسجد حرام میں نبی کریم

ﷺ نے بتوں کو لاٹھی سے توڑا، لیکن بعض لوگ اسے بے

موقع اور نفرت انگیز انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ

لوگ مذہب کے معاملے میں حساس ہوتے ہیں، اور غیر مسلم

یہ سن کر متنفر ہو جاتے ہیں اور اصلی اسلام کا مطالعہ نہیں

کرتے۔

حالانکہ اصل پہلو یہ ہے کہ نبی ﷺ غم خوار اور رحمدل تھے۔ یہاں تک کہ ان کی یہ تمنا تھی کہ اللہ اس تقدیر کو بدل دے جس میں انسان ظلم کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے دل پر مہر لگائی گئی ہو اور توبہ کا دروازہ کھلا ہونے کے باوجود توبہ کی توفیق نہ ہو۔ نبی ﷺ کی حرص اور غم خواری یہ تھی کہ سب کو توبہ کی توفیق مل جائے اور وہ جہنم سے بچ کر جنت میں جائیں۔

جس طرح کسی کو کینسر یا گردے میں پتھری ہو، اس کی والدہ اس کی تکلیف پر غم خوار ہو جاتی ہے، ایسے ہی ہر نبی اپنی امت کے لیے روحانی والد کی طرح غم خوار ہوتا ہے، والدین سے

بھی زیادہ۔ اس لیے حضرت محمد ﷺ کو بتوں پر (اللہ کی

خاطر) غصہ آیا کہ ان کی وجہ سے لوگ جنت سے محروم ہو کر

جہنم میں جا رہے تھے۔ اور جب آپ نے ان بتوں پر ضرب لگائی

تو فرمایا:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

(17:81)

ترجمہ: اور کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا، بیشک

باطل نابود ہونے والا ہے۔

اسی طرح بیان کرنے سے نبی ﷺ کی شفقت اور اچھی نیت

غیر مسلموں پر واضح ہو جاتی ہے، جبکہ بے موقع اور بداخلاقی

سے بیان کرنے سے محاربین کی مدد ہو جاتی ہے۔

اور یہ مسجد حرام کا اصول اور قانون ہے کہ وہاں نہ بت رہیں

گے اور نہ کافر۔ یہاں تک کہ اگر ضرورت پڑی تو جنگ کے

ذریعے بھی انہیں وہاں سے نکالا جائے گا تاکہ مسجد حرام کفر و

شرک سے پاک ہو۔ اگر کوئی شخص منافقانہ طرز عمل

اختیار کرے اور اس کی منافقت سورج کی روشنی کی طرح واضح

ہو جائے، تو اس پر سزا بھی لازم آ سکتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے

کہ مسجد حرام ہمیشہ کفر و شرک سے محفوظ رہے۔ اسی وجہ سے وہاں کے آس پاس کے علاقوں میں غیر مسلم اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے میں آزاد نہیں ہیں، کیونکہ تبلیغ کے ذریعے مذہب پھیلتا ہے اور اگر اجازت دی گئی تو دوبارہ مسجد حرام میں کفر و شرک کا قیام ممکن ہو سکتا ہے۔

یہ پابندی کہیں اور ملکوں میں لگانا بھی اصلی اسلام کے مطالعے اور قبولیت کے لیے رکاوٹ بن سکتا ہے، کیونکہ لوگ اس پابندی کو غلط انداز میں سمجھ کر اسلام سے متنفر ہو سکتے ہیں۔ اندازے کے مطابق تقریباً 20 غیر مسلم اس نیت سے

اسلام کی مخالفت کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی تو انہیں اپنے مذہب کی آزادی نہیں دی جائے گی۔

اسی طرح جو 10 (اصلی) مخالفین تھے، وہ 100 مخالفین بن کر اصلی اسلام کے پھیلنے میں رکاوٹ بن گئے۔ ان 100 مخالفین میں 10 محاربین بن گئے، جن کے خلاف جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ من گھڑت اسلام کی مخالفت میں 70 لوگ اصلی اسلام کے پھیلنے میں رکاوٹ بن گئے، جبکہ 20 لوگ اپنے مذہب کی آزادی کے لیے اسلام کی مخالفت کرنے لگے۔

یوں کفار کی دو جماعتیں بن گئیں:

1. محاربین (10)

2. غیر محاربین (70) 20 + 90 =)

جہاد کے اصول کے مطابق دل کی بھڑاس نکالنے یا غصے میں

مارنے سے جہاد کا ثواب حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ کراہت کے

ساتھ جواز کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ مارنا تو محارب کو

بالآخر لازم ہی ہے۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا، اسلام کی سربلندی اور پھیلاؤ کے لیے لڑنا جہاد ہے، اور اسی طرح جہاد کی فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

محارب کو گستاخی رسول ﷺ پر مارنا جائز ہے، لیکن ہر گستاخی رسول کی سزا قتل نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ محارب کی توبہ مرتے دم تک اسلام پر قائم ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ دوبارہ مرتد ہو جائے، تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی پچھلی توبہ ایک چال تھی۔ اس لیے صرف اس مرتد کی سزا قتل ہے، کیونکہ اس پر مہر لگ چکی ہوتی ہے اور وہ اصلی اسلام کو روکنے کی کوشش کرے گا، یعنی وہ محارب ہی رہے گا۔

غیر محارب اگر مرتد ہو جائے، تو اس پر قتل کا حکم نہیں ہوگا، کیونکہ وہ محارب کی صف میں شامل نہیں ہوتا اور اس کی مرتدیت اسلام کے پھیلاؤ کے لیے براہِ راست خطرہ نہیں پیدا کرتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اس طرح نبی ﷺ نے فرمایا کہ کفار کو اپنے خلاف للکارنا مت۔

چونکہ جہاد محاربین کے خلاف ہے اور پروپیگنڈا یا دیگر

حربوں کی وجہ سے غیر محاربین بھی محاربین کے ساتھ دینے

لگتے ہیں، اس لیے مسلمانوں کو بہترین اخلاق، صبر، لفظوں

میں ہجرت، اور مکان میں ہجرت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اس

طریقے سے غیر محاربین محاربین سے الگ ہو جائیں۔ اس

طرح جہاد میں ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور دنیا اسلام سے

متنفر نہ ہو، اور یوں اسلام کے پھیلاؤ میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

موجودہ دور میں تین جماعتیں ہیں: مسلمان، محاربین، اور غیر محاربین۔

امام مہدی رح جب نزول فرمائیں گے تو ناکارہ علماء کو ختم کریں گے اور یوں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول تک اصلی اسلام سورج کی روشنی کی طرح غیر محاربین پر واضح ہو جائے گا۔ اور جب حق مکمل واضح ہو جائے گا تو پھر صرف دو جماعتیں باقی رہ جائیں گی: مسلمان اور محاربین۔

غیر محاربین میں بعض مسلمان ہو جائیں گے، اور بعض ضد و عناد کی وجہ سے محاربین اور دجال کے ساتھ شامل ہو جائیں

گے۔ یوں غیر محاربین ختم ہو جائیں گے اور جزیہ کی

ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اس لیے عیسیٰ علیہ السلام تمام کفار

کے خلاف جہاد کریں گے۔ یہاں "تمام" سے مراد وہ محاربین

ہی ہیں جو دجال کے پیروکار ہوں گے۔ (اس سے یہ مطلب نکالنا

ناقص ہے کہ ہر کافر کو مارنا جائز ہے، کیونکہ عیسیٰ علیہ

السلام محاربین کو ہی نشانہ بنائیں گے۔)

اس کے بعد مومن اور برائے نام مومن رہ جائیں گے۔ جس کے

دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا، اسے اللہ تعالیٰ ٹھنڈی ہوا کے

سبب مار دے گا۔ پھر برائے نام مومن رہ جائیں گے، نہ وہ

نیکی کو پہچانیں گے اور نہ برائی کو برائی تصور کریں گے۔

پھر شیطان انہیں غیر اللہ کی عبادت کی طرف راغب کرے گا

اور ان کی ظاہری زندگی خوب عیش و آرام میں ہوگی تاکہ ان

کے نیکیوں کا بدلہ اس دنیا میں ختم ہو جائے، اور پھر اچانک

قیامت آئے گی۔

سوال: کیا محاربین ختم ہو چکے ہیں؟

جواب: جب تک دین اسلام پوری دنیا پر واضح اور نافذ نہیں

ہوگا اور حاکمیت اکیلے للہ کا نہ ہو جائے، تب تک محاربین

رہیں گے اور ان کی خفیہ تدابیر بھی جاری رہیں گی۔ اس لیے

جہاد فی قتال بھی جاری رہے گا۔ یہ محاربین قیامت تک رہیں

گے، جیسا کہ حدیث میں بھی مفہوم بیان ہوا ہے: جہاد قیامت

تک جاری رہے گا۔

لیکن غیر محاربین کے ساتھ حسن سلوک برقرار رہے۔

---

5. اختتامیہ

جہاد کا فلسفہ صرف اصلاح معاشرہ، اسلام کی سربلندی، اور محاربین کے ذریعہ پھیلنے والے فساد کو ختم کرنا ہے۔ غیر محاربین کے ساتھ حسن سلوک اور تعلیم کے ذریعے انہیں اسلام کی طرف راغب کرنا واجب ہے۔

یہ اصول نہ صرف تاریخی حالات میں واضح تھے بلکہ آج بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق معاشرتی انصاف اور دین کی سربلندی کے لیے لاگو ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

قرآن مجید آخری کتاب ہے اور حضرت محمد ﷺ آخری نبی و رسول ہیں۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ ایک جامع کلام ہے۔

قرآن پر عمل کرنا ، دراصل تورات، انجیل وغیرہ پر عمل کرنے کے مترادف ہے، کیونکہ تمام آسمانی کتابوں کا نچوڑ اور خلاصہ، یعنی لا إله إلا الله، اسی کتاب میں موجود ہے۔

یہ کتاب ایک شاہی دستور ہے، جس کے قوانین کو فردی اور اجتماعی طور پر نافذ کرنا لازم ہے۔

یہ شاہی دستور قیامت تک کے تمام ادوار کے لیے حق اور موزوں

ہے۔

پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف رسولوں پر اپنے شاہی دستور اور

کتاب نازل فرمائی تاکہ ان کی اشاعت ہو۔ ان کے ساتھ انبیاء

علیہم السلام بھی بھیجے جاتے تاکہ دستور کو واضح کریں اور

معجزات دکھائیں تاکہ یہ ثابت ہو کہ یہ کتاب و دستور اللہ کی

طرف سے ہے۔

پھر قرآن مجید کی اشاعت کے لیے حضرت محمد ﷺ کو

بھیجا گیا، اور آپ ﷺ کے ساتھ معجزات بھی تھے۔ آپ

ﷺ کی وفات کے بعد تمام معجزات ختم ہو گئے، سوائے قرآن مجید کے۔ قرآن مجید کا معجزہ قائم رہ گیا اور قیامت تک اس کی اشاعت کرنا ہر مومن کی ذمہ داری ہے۔

نئے نبی کی ضرورت نہیں کیونکہ جب داعی اخلاق کے دائرے میں، تہذیب یافتہ الفاظ میں قرآن مجید کی تعلیم بیان کرتا ہے، تو قرآن کا معجزہ طلبگاروں پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور زمین کی پیداوار یا انسان کا تخلیق کردہ نہیں ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

برزخ زندگی

وَمَنۡ أَضَلُّ مِمَّنۡ يَّدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَنۡ لَّا يَسۡتَجِيبُ لَهٗٓ إِلَى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ وَهُمۡ عَنۡ دُعَائِهِمۡ غَافِلُونَ ۞

ترجمہ: 46:5

"اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوسکتا ہے جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے سکے اور ان کو ان کے پکارنے کی خبر بھی نہ ہو؟"

یہ آیت خاص طور پر برزخ زندگی میں رہنے والوں کے بارے

میں ہے، کیونکہ اس میں "إلى يوم القيامة" کی قید لگائی گئی

ہے۔ زندہ انسان عادۃً جواب دے سکتے ہیں، اور فرشتے بھی

جواب دے سکتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے مفہوم: جب

غائب بھائی کے لیے دعا کی جائے تو فرشتے آمین کہتے ہیں اور

کہتے ہیں تمہارے لیے بھی ایسا ہو۔ لیکن برزخ میں رہنے والے

عادۃً جواب نہیں دے سکتے اور قیامت تک غافل ہیں۔ اگر کہا

جائے کہ اللہ کی مشیت کے بغیر وہ جواب نہیں دے سکتے تو

قیامت تک کی قید کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ لہذا یہ

آیت خاص برزخ زندگی میں رہنے والوں کے لیے ہے۔

اس آیت میں اور کوئی مناسب احتمال نہیں ہے، اس لیے یہ ایک قطعی دلیل ہے۔ کسی کو اس سے مستثنیٰ کرنے کے لیے یا تو قرآن کی دوسری آیت درکار ہے یا متواتر حدیث۔

جو خبر واحد احادیث مذکورہ آیت کے خلاف ہوں، ان میں مناسب تاویل کی جائے گی، مثلاً:

"تمھارا درود مجھ ﷺ پر پیش کیا جاتا ہے۔"

یہ حدیث سوالِ مقدرہ کا جواب دیتی ہے کہ آیا درود آپ ﷺ کی زندگی پر خاص ہے یا وفات کے بعد بھی ایصال ثواب پہنچتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ درود شریف کا ایصال ثواب پہنچتا ہے اور

درجات بلند کیے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ نبی ﷺ کو معلوم

ہوتا ہے کہ فلاں نے درود پڑھا۔

نبی ﷺ بھی قیامت کے دن گواہی دیں گے کہ جب تک زندہ

تھے خبر رکھتے تھے، وفات کے بعد نہیں۔

اگر نبی ﷺ مذکورہ آیت سے مستثنیٰ ہوتے تو قبر کے قریب

دعا کرنا جائز ہوتا، لیکن عمر رضی اللہ عنہ بارش کے لیے دعا

کرتے وقت آپ ﷺ کے وصال کے بعد عباس رضی اللہ عنہ

کو دعا کے لیے کہتے تھے۔ یہ واضح دلیل ہے کہ نبی ﷺ مذکورہ

آیت سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

برزخ میں رہنے والے عادۃً دنیاوی انسان کی پکار کا جواب نہیں

دے سکتے، بلکہ قیامت تک غافل ہیں۔ غفلت کی وجوہات ہو

سکتی ہیں: مصروفیت، ہماری آواز کی ناقابل سماعت

فریکوئنسی یا دوری۔ لیکن آیت کہتی ہے کہ وہ غافل یقینی

ہیں۔ قرآن وہ بات نہیں بتاتا جس کا کوئی فائدہ نہ ہو اس لئے

اگر سنائی دیتا بھی ہو تو فائدہ کیا جب غافل ہو۔

نوٹ:

ایک اصل حقیقت ہوتی ہے جسے اللہ بہتر جانتا ہے، اور ایک

بقدرِ ضرورت حقیقت ہوتی ہے جو عقل سلیم اور محکمات کے

مطابق ہوتی ہے۔ مذکورہ مفہوم بقدرِ ضرورت حقیقت ہے،

جبکہ برزخ کی اصل حقیقت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے "لا تشعرون" کا صیغہ استعمال فرمایا ہے، یعنی یہ متشابہات میں سے ہے۔ بعض اہل علم برزخ کی اصل حقیقت بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ برزخ اور جنت کی زندگی بہت مختلف ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے: جنت میں ایسی نعمتیں ہیں جن کا تصور بھی انسان نے نہیں کیا۔

برزخ کی بقدرِ ضرورت حقیقت کا مقصد یہ ہے کہ برزخ میں رہنے والوں سے دعا طلب کرنا لغو ہے۔ اللہ کو راضی کرنے کے وہ طریقے اپنائیں جو قرآن و حدیث سے ثابت ہیں۔

حیات اور موت کے معنی:

قرآن میں حیات اور موت کے کئی معانی ہیں:

روح اور دنیاوی بدن کے ساتھ نیکی کا موقع میسر ہو تو اسے عادةً حیات کہا جاتا ہے۔

جب روح دنیاوی بدن سے جدا ہو جائے اور نیکی و ایمان کا موقع ختم ہو تو اسے عادةً موت کہا جاتا ہے۔

مقصد کی زندگی گزارنا حیات ہے، اور بے مقصد زندگی گزارنا

موت ہے۔ شہید مر کر بھی نیکیاں حاصل کر رہا ہے، یعنی

مقصد کی زندگی گزار رہا ہے، اس لیے وہ زندہ ہے۔ آخرت میں

زندگی کا مقصد جنت ہے۔ جہنمی بے مقصد زندگی گزار رہا ہے،

اس کے بارے میں فرمایا گیا:

إِنَّهُۥ مَن يَأْتِ رَبَّهُۥ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُۥ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۞

20:74

برکات والی نعمتوں اور خوشحالی میں رہنا بھی حیات کہلاتا ہے،

جیسے کہ شہداء برکات میں جی رہے ہیں، اس لیے انہیں اموات نہ

کہا جائے بلکہ احیاء کہا جائے۔

رہی وہ موت جو انسان کے کامن سینس میں محسوس ہوتی ہے،

اس کا وجود حقیقی نہیں۔ موت میں اصل چیز عارضی جدائی

ہے اور نیکی کا موقع گنوانا ہے، باقی تقریباً سب اوہام ہیں، مثلاً:

"میری اولاد کا کیا ہوگا؟" تمہاری اولاد کا رب پہلے بھی اللہ تھا

اور آئندہ بھی اللہ ہی ہوگا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

—–

قارئین کرام! یہ کتاب جلد 1 اپنے اختتام کو پہنچی، اور ان شاءاللہ جلد 2 بھی پیش کی جائے گی۔ میں نے اپنی استطاعت کے مطابق تحقیق اور اجتہاد پیش کیا ہے، لیکن ہر بات کی صداقت کا انحصار آپ کی اپنی تحقیق اور غور و فکر پر ہے۔ اس لیے براہ کرم ہر بیان کو بلا تحقیق نہ قبول کریں، بلکہ اسے پرکھیں اور قرآن و حدیث اور معتبر علماء کی روشنی میں جانچیں۔ آپ کی محنت اور فہم سے ہی علم کی روشنی پھیلتی ہے اور اسلامی تعلیمات کی صحیح سمجھ ممکن ہوتی ہے۔

- ــــــــ

ربنا تقبل منا انک انت السميع العليمِ آمين يا رب العالمين

ـ

ــــــــ